ہفت روزہ

لیل و نہار



۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء





اس ہفتے کراچی میں

پولیس ہتھکڑی

اور ہڑتال

عوامی رہنماؤں

کے لئے بیڑیاں!

تفصیلات صفحہ ۵ پر

ملاحظہ کیجئے

قیمت مغربی پاکستان میں ۶۰ پیسے مشرقی پاکستان میں ۷۵ پیسے

ہفت روزہ کراچی

لیل و نہار

جلد ۲ | ۲۵ تا ۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء | شمارہ ۴

ادارہ تحریر

فیض احمد فیض ——— حسن عابدی

امین مغل لاہور ——— احمد الیاس ڈھاکہ

واپس آنا پیر صاحب کا ——— ۷

یہ وقت آئین سازی کا ہے ——— ایک دردمند مسلمان ——— ۸

کچھ دیر جوش صاحب کے ساتھ ——— نمائندہ خصوصی ——— ۹

پی آئی اے کی ہڑتال ——— نعیم آروی ——— ۱۱

امریکہ اور امن عالم ——— مولانا غلام رسول مہر ——— ۱۵

سوشلسٹ ملک بہترین دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔ ——— ۱۷

۵۰ لاکھ فوجی مشیر پنٹاگن کے ملازم ہیں۔ ——— ۱۸

سب جیت گئے (نظم) — انور احسن صدیقی — ۱۹

نوشتۂ دیوار " — ۱۹

تشنہ لبان دشتِ غم (نظم) — ساقی جاوید — ۱۹

عوام صحافت کو آزاد کرائیں گے ——— امین مغل ——— ۲۰

یہ تمام ترقی پسند جمہوری طاقتوں کی کامیابی ہے ——— مصطفیٰ ——— ۲۵

نیا سال پلٹنا گھاؤ ——— (منگولیا کا افسانہ) ——— ناچا گورج ——— ۲۸

بائیں بازو کی تحریک کے چند مسائل ——— علی امجد جعفری ——— ۳۳

ڈھاکہ سے ایک خط ——— احمد الیاس ——— ۳۵

فون نمبر ——— ۴۱۷۴۹۰

قیمت

مغربی پاکستان میں ——— ۶۰ پیسے

مشرقی پاکستان میں ——— ۷۵ "

گوادر ۔ پسنی میں ——— ۷۰ "

برطانیہ میں ——— ۲ شلنگ ۶ پنس

پوسٹ بکس نمبر ۳۱۷۸ - کراچی ۲۹

دولت آسمان سے نہیں برستی

صدرِ مملکت نے کیا خوب فرمایا کہ دولت آسمان سے نہیں برستی بلکہ جب تک سخت محنت نہ کی جائے زمین سے بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اُن کا یہ ارشاد بہت بروقت تھا کیونکہ اپنی کوٹھیوں پر ہذا من فضلِ ربی کے کتبے آویزاں کرنے والے سرمایہ دار اور اُن کے ٹکڑوں پر پلنے والے اسلام فروش ملّا، گزشتہ ۲۳ سال سے یہی تلقین کر رہے ہیں کہ دولت عطیۂ خداوندی ہے۔ وہ لوگوں کی محنت مشقت سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے دولت مند بناتا ہے اور جسے چاہتا ہے مفلس رکھتا ہے۔ جنرل یحییٰ خاں نے لاڑکانہ میں تقریر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہر شخص کو خواہ وہ کھیتوں میں کام کرتا ہو یا فیکٹری میں پیداوار بڑھانے کے لئے ان تھک محنت کرنی چاہیئے۔ پیداوار بڑھے گی تو برآمدی تجارت میں اضافہ ہوگا اور ملک زیادہ زرِ مبادلہ کمائے گا اور لوگ زیادہ خوش حال ہوں گے۔

صدرِ پاکستان کے مشورے سر آنکھوں پر مگر اس کا کیا علاج کہ ہمارے سماجی نظام میں جو لوگ اپنا خون پسینہ کر کے دولت پیدا کرتے ہیں وہی اِس دولت سے محروم رہتے ہیں۔ کوئی شخص ہمارے کاشتکاروں اور مزدوروں پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ کام چور ہیں یا مفت کی روٹی کھانے کے عادی ہیں۔ وہ تاروں کی چھاؤں میں کام پر جاتے ہیں اور شام کے جھٹپٹے میں گھروں کو لوٹتے ہیں۔ وہ کھیتوں، کارخانوں اور دفتروں میں دن رات ایک کر کے ملک کی پیداوار بڑھاتے ہیں، برآمدی تجارت میں اضافہ کرتے ہیں، زرِ مبادلہ کماتے ہیں لیکن اِس محنت کا انہیں اجر یہ ملتا ہے کہ اُن کی جھونپڑیوں میں نہ روشنی ہے نہ پانی۔ جب کہ ہذا من فضلِ ربی والوں کے بنگلوں میں دن کو بھی بجلی جلتی ہے اور اُن کے لان کی گھاس پانی کی فراوانی سے ہر وقت تر و تازہ رہتی ہے۔ اُن کو نہ سواری کی سہولتیں ملتی ہیں نہ طبّی امداد نصیب ہے اور نہ اُن کے بچوں کی تعلیم کا کوئی معقول بندوبست کیا جاتا۔ چھانٹی اور بیروزگاری کا خطرہ اس پر مستزاد ہے۔

سوشلسٹ ملکوں کا تو ذکر ہی فضول ہے کیونکہ وہاں دولت پیدا کرنے کے تمام بنیادی ذریعے (زمین، کانیں، کلیدی صنعتیں وغیرہ) محنت کشوں کی اجتماعی ملکیت ہیں، خود مغرب کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں کے سرمایہ داروں کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ جب تک مزدور اور کاشتکار ذہنی اور مادی طور پر آسودہ نہ ہوں پیداوار نہیں بڑھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ، امریکہ، فرانس اور مغربی جرمنی جیسے سرمایہ دار ملکوں میں بھی محنت کشوں کو زندگی کی بنیادی سہولتیں ضرور حاصل ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ذہنیتوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ محنت کشوں کو اجرت یوں دیتے ہیں گویا خیرات بانٹ رہے ہوں۔ مگر عوام نے حالیہ انتخابات میں ووٹ دے کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ اب اپنے تاریخی منصب اور معاشی حق سے آگاہ ہو گئے ہیں اور دولت کی پیداوار میں اپنا جائز حصہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ صدرِ مملکت عوام کی خوشحالی کے خلوص سے خواہشمند ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ فقط پیداوار بڑھانے سے خوشحالی نہیں آتی کیونکہ گزشتہ ۲۳ سال کا تجربہ شاہد ہے کہ ملک کی پیداوار تو بڑھی ہے لیکن عوام خوشحال ہونے کے بجائے اور بدحال ہو گئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ پیداوار میں اضافے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے موجودہ معاشرتی اور معاشی نظام میں بنیادی تبدیلی کی جائے۔ سرمایہ داری نظام کے اندر رہتے ہوئے پیداوار بڑھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ داروں کے نفع کی مقدار اور شرح بڑھائی جائے۔ اس سے محنت کشوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

صدرِ مملکت نے اشیاءِ صرف کی قیمتوں میں اضافے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مہنگائی کا اصل سبب بازار کے غیر یقینی حالات ہیں۔ یہاں کئی سوال قدرتی طور پر ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ کیا حالات واقعی غیر یقینی ہیں، دوئم یہ کہ یہ غیر یقینی حالات کس نے پیدا کئے ہیں اور تیسرے یہ کہ جن عناصر نے یہ غیر یقینی حالات پیدا کئے ہیں۔ اُن سے کوئی باز پُرس ہونی چاہیئے یا نہیں۔ ہماری ناچیز رائے یہ ہے کہ غیر یقینی حالات مصنوعی اور فرضی ہیں قدرتی نہیں ہیں۔ اگر غیر یقینی حالات سے مراد یہ ہے کہ ابھی تک آئین وضع نہیں ہوا ہے اور نہ کوئی نمائندہ حکومت قائم ہوئی ہے تو عرض ہے کہ ملک میں تو گزشتہ دو سال بلکہ بارہ سال سے نہ کوئی جمہوری آئین رائج ہے اور نہ نمائندہ حکومت قائم ہے پھر انتخابات کے فوراً بعد کون سی مصیبت آگئی کہ اشیاءِ صرف کی قیمتیں اچانک چڑھ گئیں۔ گزشتہ دو ماہ میں نہ تو فیکٹریوں اور کارخانوں کی پیداوار گھٹی ہے اور نہ کوئی ارضی یا سماوی آفت آئی ہے جس کی وجہ سے اناج، سبزیوں اور مویشیوں کی پیداوار کم ہو گئی ہو۔ پھر اِن چیزوں کے دام کیوں بڑھ رہے ہیں۔ کیا سرمایہ داروں اور آڑھتیوں کی مانند یہ چیزیں بھی سوشلزم کے خوف سے ہراساں ہیں۔ ۱۹۶۸ء کے موسم سرما میں جن دنوں ایوب خاں کے خلاف جلوس، جلسوں اور ہڑتالوں کا زور تھا تو غیر یقینی حالات کا عذر قابلِ قبول ہو سکتا تھا لیکن آج کل تو ملک میں مارشل لا کی مستحکم حکومت قائم ہے۔ ایسی حالت میں مہنگائی کے لئے غیر یقینی حالات کی دلیل اُن لوگوں کو مطمئن نہیں کر سکتی جو حکومت سے درمانِ درد اور دُرستی احوال کی توقع رکھتے ہیں۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ چند ماہ قبل جب مہنگائی شروع ہوئی تو صوبائی حکومتوں نے نگراں کمیٹیاں مقرر کی تھیں تاکہ اشیاءِ صرف کی قیمتیں بڑھانے والوں پر کڑی نگاہ رکھی جائے اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ افسوس ہے کہ اِن نگراں کمیٹیوں کی فرض شناسی اور کارکردگی کی تفصیلات سے ہم آگاہ نہیں ہیں لیکن قیمتوں میں مسلسل اضافہ خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ کمیٹیاں اپنے فرائضِ منصبی میں ناکام رہی ہیں۔ اور اب تو اربابِ اختیار نے پٹرول کی قیمت بڑھا کر دوسروں کو بھی قیمتیں بڑھانے کا جواز مرحمت کر دیا ہے۔ غالب نے چارہ سازی اور غمگساری کے اس انداز کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا!



ان کے پاؤں میں آج بھی بیڑیاں ہیں

انتظامیہ سے ہمارا مطالبہ ہے کہ سیاسی کارکنوں اور ٹریڈ یونین رہنماؤں کو قاتل، ڈکیت اور خطرناک مجرم سمجھنا چھوڑ دے —

حال ہی میں چند ٹریڈ یونین رہنماؤں کو زیرِ سماعت مقدمات کے سلسلے میں شہر کی ایک عدالت کے رُوبرو پیش کیا گیا۔ یہ رہنما داؤد کاٹن ملز کی ٹریڈ یونین سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس ملز کی طویل ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار ہوئے ہیں۔ انہیں مارشل لاء کے تحت مختلف میعاد کی سزائیں ہو چکی ہیں، لیکن مزدور رہنماؤں کی "فردِ جرم" اتنی طویل ہے کہ قید و بند کی محض چند سزاؤں سے ان کا کفارہ ادا نہیں ہو سکتا، لہٰذا مزید مقدمے اور مزید سزائیں داؤد کاٹن ملز کے رہنماؤں کی خطائیں شمار میں کتنی ہیں اور کس قدر شدید ہیں یہ باتیں عدالت کے علم میں ہوں گی، فی الوقت ان پر تبصرہ ممکن نہیں، لیکن ہم نے تو یہ دیکھا کہ مزدوروں کے یہ مقبول رہنما جب عدالت میں پیش ہوئے اور جب یہاں سے واپس ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور پاؤں، بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ پاؤں بیڑیوں سے کس طور گراں بار ہوتے ہیں، یہ کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ مختصر یہ کہ مُجرم نہ بیٹھ سکتا ہے، نہ لیٹ سکتا ہے، صرف کھڑا رہ سکتا ہے۔ اور دونوں ٹانگوں کو فاصلے پر رکھ کر چل سکتا ہے۔ برطانوی دورِ تسلط میں ان شوریدہ مزاج قیدیوں کو جو انگریزی حکومت سے "گستاخی" کے مرتکب ہوتے تھے، بیڑیوں میں کس کر رکھا جاتا تھا۔ ٹریڈ یونین رہنماؤں کو مبارک ہو کہ ہماری تاریخِ آزادی کے جلیل القدر رہنماؤں کا یہ زیور آج ان کے حصے میں آیا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جیل خانوں میں بیڑیوں کا استعمال کم ہو گیا تھا اگرچہ سیاسی کارکنوں اور ٹریڈ یونین رہنماؤں کی گرفتاری کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ بہر حال نئے حاکموں نے ایسے شوریدہ سر لوگوں کے لئے محض ہتھکڑی کا استعمال کافی سمجھا اور بیڑیاں جیلوں میں، خطرناک قیدیوں کے لئے استعمال ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ بیڑیوں کا استعمال بطور سزا محدود ہو کر رہ گیا۔ اور یہ سزا بھی جیلوں میں اخلاقی مجرموں، قاتلوں اور ڈاکوؤں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی، جیل کے حاکموں اور پولیس کے عہدیداروں کو یہ بات بہت دیر میں یاد آئی کہ ٹریڈ یونین کے کارکن اور رہنما "قاتلوں اور ڈاکوؤں" سے کچھ کم "خطرناک" نہیں ہوتے۔

ہمیں یاد ہے کہ اب سے کوئی دس سال پہلے سابق صوبہ مغربی پاکستان کے انسپکٹر جنرل پولیس نے ٹریڈ یونین کے رہنماؤں اور عام سیاسی کارکنوں کے ضمن میں اپنے ماتحت عملہ کو تاکید کی تھی کہ گرفتاری کے بعد انھیں ہتھکڑی نہ لگائی جائے لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ انہیں بیڑی بھی نہ لگائی جائے۔

انتظامیہ سے ہمارا مطالبہ ہے کہ سیاسی کارکنوں اور ٹریڈ یونین رہنماؤں کو قاتل ڈکیت اور خطرناک مجرم سمجھنا چھوڑ دے۔ یہ لوگ عوام کے رہنما ہیں۔ عوام نے ان پر اپنا اعتماد ثابت کر دیا ہے۔ مستقبل انہی رہنماؤں کا ہے۔ باقی رہے وہ سازشی عناصر جو انھیں بیڑیاں پہناتے ہیں تو عوام کی عدالت میں ایک دن خود انھیں پیش ہونا پڑے گا۔

انتظامیہ اور پولیس کی غیر جانبداری کے بارے میں اکثر دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن ٹریڈ یونین کے تنازعوں میں ان کے "غیر جانب دارانہ" طرزِ عمل کا پول کھل جاتا ہے اور یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ طبقاتی معاشرے میں پولیس اور انتظامیہ کے عہدیدار، اسی طبقے کا ساتھ دیتے ہیں، جس سے فوری فائدے کی اُمید ہوتی ہے، لیکن ہمیں یقین ہے کہ نفع اندوزی کا یہ رویّہ زیادہ عرصے باقی نہیں رہے گا۔

سرورق

احتجاج کسی بھی مسئلہ پر ہو اور کوئی بھی کرے، پولیس، سامنے آنے والے ہر شخص کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانکتی ہے۔ لاٹھیاں، بیڑیاں اور قید و بند آخر کب تک ان لوگوں کا مقدر رہیں گے، جو محنت کش عوام کو جینے کا حق دلانا چاہتے ہیں؟ -

گلگت میں فائرنگ کے بعد

گلگت اِن دنوں برف پوش ہے، راستے برف سے بند ہیں۔ پہاڑیاں اور وادیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں، لیکن ۱۲ جنوری کی بات ہے کہ اچانک برف زاروں سے شعلے اُٹھنے لگے اور سرما کی مضمحل فضا مشتعل جذبات کی حرارت سے گرم اور لہو سے گلنار ہو گئی۔

گلگت کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں جہاں عالی مدار حکام کی اولاد بھی زیرِ تعلیم ہے، ہیڈ مسٹرس نے ایک اعلیٰ عہدیدار کی صاحبزادیوں سے یہ گستاخی کی کہ انہیں امتحان میں فیل کر دیا۔ ہیڈ مسٹرس کو یاد نہیں رہا تھا کہ پولیٹیکل ایجنٹ اور اس کا عملہ، اس علاقے کا حاکمِ کُل ہے اور شخصی حکومتوں میں یہ تو نہیں ہوتا کہ کوئی ایسا کام کیا جائے جو حاکم کی ناگوارئ طبع کا موجب ہو۔

ہیڈ مسٹرس کو پولیٹیکل ایجنٹ کے دربار میں فوراً طلب کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ دفتر میں اس افسر کے روبرو ہیڈ مسٹرس کو پیش ہونا تھا، جس کی صاحبزادیوں کو فیل کرنے کی گستاخی سرزد ہوئی تھی، لیکن ہوا یہ کہ صاحبزادیوں کی والدہ وہاں پہلے سے موجود تھیں اور بھری بیٹھی تھیں۔ ہیڈ مسٹرس نے ان کی بچیوں سے ناروا سلوک کر کے درحقیقت بیگم صاحبہ کا اور اس لحاظ سے، اس پورے علاقے کی انتظامیہ کا عتاب مول لیا تھا۔

افسر کی بیگم، انتظامیہ کی "غیر سرکاری عہدیدار" ہوتی ہے۔ لیکن "غیر سرکاری" کی اصطلاح سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے، وہ بالعموم تُند خُو، سخت گیر اور اپنے "صاحب" کے جاہ و جلال کی محافظ اور اس لحاظ سے سرکار سے بھی کچھ زیادہ "سرکاری" ہوا کرتی ہے، لہٰذا افسر کی بیگم نے اپنے منصب کا وقار ملحوظ رکھتے ہوئے ہیڈ مسٹرس کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کہا جاتا ہے کہ جواب میں ہیڈ مسٹرس نے اپنی صفائی پیش کی اور کوئی گُستاخانہ کلمہ ان کی زبان سے نکل گیا، افسروں نے اس طرزِ عمل پر فوری کارروائی کی اور ہیڈ مسٹرس کو معطل کر دیا۔

۱۱ جنوری کا ذکر ہے۔ گلگت کے شہریوں کا ایک وفد ریذیڈنٹ کی خدمت میں یہ گزارش لے کر حاضر ہوا کہ ہیڈ مسٹرس کو فوراً بحال کیا جائے۔ وفد نے اس موقع پر یہ بھی کہا کہ پولیٹیکل ایجنٹ نے چونکہ اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے، لہٰذا انہیں معطل کر دیا جائے۔ لیکن ہیڈ مسٹرس کے ساتھ بدسلوکی کی خبر اس وقت تک پوری بستی میں پھیل چکی تھی، اور لوگوں میں سخت

پاکستان کے لوگو!

"پاکستان کے لوگو! بنیادی حقوق ہمیں کیوں نہیں دلواتے؟" اس عُنوان کے تحت گلگت اور بلتستان کے لوگوں کے مطالبے کی تفصیلات نامہ و پیام کے زیرِ عنوان صفحہ ۳۸ پر ملاحظہ کیجئے۔

اشتعال پھیل گیا تھا جو برسوں سے کالے قوانین کے تحت زندگی گزارتے اور بنیادی انسانی حقوق کا مطالبہ کرتے آئے ہیں۔ ان کے دل پہلے سے دُکھے ہوئے تھے۔ جذبات اندر ہی اندر آتش فشاں کے لاوے کی طرح پک رہے تھے۔

۱۱ اور ۱۲ جنوری کو شہر میں جگہ جگہ جلسے ہوئے ۱۲ تاریخ کو دُکانیں بند رہیں، ہیڈ ماسٹر کی بحالی اور بنیادی شہری حقوق کی بازیابی کے مطالبے، باقاعدہ مظاہرے اور احتجاج کی صورت اختیار کر گئے۔ بعد کی "اطلاع" یہ ہے کہ ایک مشتعل ہجوم نے ایک کان اور تھانے میں توڑ پھوڑ کی اور جیل پر حملہ کر کے سات قیدیوں کو چھڑا لیا۔ اس طرح کی "اطلاع" اس وقت دی جاتی ہے، جب پولیس اور انتظامیہ اپنی انتہائی کارروائی کا "جواز" پیش کرنا چاہتی ہے چنانچہ پولیس کی طرف سے یہ بتایا گیا کہ مشتعل ہجوم کے پتھراؤ کے جواب میں نادرن اسکاؤٹس کے دستے کو فائرنگ کرنی پڑی، جس سے دو افراد ہلاک اور سات زخمی ہوئے۔ ممکن ہے، اصل اعداد اس سے زیادہ ہوں۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ گلگت میں متعین تمام اعلیٰ حکام کے تبادلے کر دیئے گئے ہیں اور انتظامیہ کی نگرانی کے لئے ایک اعلیٰ افسر کو بطور ناظم مقرر کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ محض ایک ناظم کے تقرر سے حل نہ ہوگا۔ گلگت، بلتستان اور نواحی علاقوں کے عوام کو شکایت محض نوکر شاہی سے نہیں، بلکہ اُن آمرانہ قوانین سے ہے، جن کی بدولت سرکاری اہل کاروں کو شاہانہ اختیارات حاصل ہیں اور بیچارہ عام آدمی، بنیادی حقوق سے بھی محروم ہے، لہذا اصل ضرورت یہ ہے کہ ان علاقوں کو پاکستان میں اسی طرح ضم کیا جائے، جیسے پاکستان کے دوسرے صوبے ہیں۔ یہاں مروجہ قوانین نافذ کئے جائیں اور ایف سی آر کے سیاہ ضابطے ختم کئے جائیں۔ ان علاقوں کے عوام کو یہاں کے نظم و نسق میں شریک کیا جائے، سکول، شفاخانے اور سماجی نوعیت کے مرکز قائم ہوں۔ یہاں کے معدنی وسائل کو ترقی دی جائے۔ سڑکیں بنیں، کارخانوں کی بنیادیں رکھی جائیں غرضکہ اس علاقے کو بھی متمدن پاکستان کا ایک حصہ بنایا جائے۔

پٹے ہوئے سیاستدانوں نے یہ شوشہ چھوڑا ہے

لسانی اور تہذیبی اختلاف کی بناء پر نہ کسی اقلیت کے خلاف تعصب جائز ہے، نہ کسی اقلیت سے یہ مطالبہ جائز ہے کہ وہ اپنی زبان یا تہذیب سے دستبردار ہو جائے۔

انتخابات میں ناکامی کے بعد رجعت پرست عناصر جن حیلوں سے اپنی ساکھ بحال کرنے کے درپے ہیں، انہی میں ایک حیلہ اردو اور سندھی کے تنازعے کا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اردو کے اُن "پشت پناہوں" میں ایک بھی اردو کا دوست نہیں اور جو لوگ سندھی کی بقا کے لیے اردو کو ختم کر دینا ہی ضروری سمجھتے ہیں، وہ دراصل دونوں زبانوں کے دشمن ہیں

ان دنوں حیدرآباد میں نام نہاد اردو دوستوں نے بھوک ہڑتالوں کا آغاز کیا ہے۔ ان کے خیال میں سندھ کے پرانے باشندے اپنی زبان سندھی کو قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں رواج دینا چاہتے ہیں اور یہ بات ایسی ہے کہ اس سے نظریہ پاکستان "خطرے میں پڑ جاتا ہے" پاکستانی قومیت کی بنیادیں ہل جاتی ہیں حتیٰ کہ ایمان بھی متزلزل ہو جاتا ہے، کیونکہ اردو کا معاملہ ان حضرات کے خیال میں صحتِ ایمان کا معاملہ ہے۔ اردو ان کے عقیدے کی رو سے چونکہ قومی زبان بن چکی ہے لہذا جہاں اردو کا سایہ پڑ جائے، وہاں کسی دوسری زبان کے زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہی وہ عصبیت ہے، جس نے پاکستان کے مختلف صوبوں میں اردو اور دوسری زبانوں کے درمیان نفرت و عناد کا بیج بویا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب بعض ایسے علاقوں میں بھی اردو کا نام نہیں سُنا جاتا جہاں اردو سے محبت واقعی جزوِ ایمان قیاس کی جاتی تھی۔ یہ کرم فرمائی "ہمارے انہی "اردو دوستوں" کی ہے اور اب انھیں سندھ میں بھی اردو کا وجود گوارا نہیں، چنانچہ اپنی لیڈری کا ایوان تعمیر کرنے کے لیے یہ لوگ اردو کی بنیادیں کھود رہے ہیں

بعض عناصر جو خود کو پرانے سندھی کہتے ہیں اور حالیہ انتخابات میں ترقی پسند نعروں کی بدولت، عوام کے ہاتھوں بُری طرح پٹ چکے ہیں، اپنی عصبیت کی دکان ایک بار پھر چمکانا چاہتے ہیں۔ ایک انتہا "اردو دوستوں" کی ہے، اور دوسری انتہا "سندھی دوستوں" کی ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ سندھی چونکہ سندھ کے رہنے والوں کی زبان ہے۔ لہٰذا اس صوبے میں، اُن لوگوں کو رہنے کا کوئی حق نہیں، جو سندھی کے سوا کوئی اور زبان یعنی اردو بولتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ اردو کو ترک کر دیں اور اس زبان سے اپنے تاریخی اور تہذیبی رشتے منقطع کر کے آئندہ کے لیے توبہ کریں۔ اردو کو فوراً دیس نکالا ملنا چاہیئے۔

اردو اور سندھی کا اختلاف عام لوگوں کا جھگڑا نہیں، بلکہ اربابِ "سیاست" کا باہمی تنازعہ ہے، سندھ کے دیہات میں اور کوچہ و بازار میں پرانے اور نئے سندھی باشندے جب آپس میں ملتے ہیں تو انہیں یہ طے کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ اپنا مفہوم کس زبان میں ادا کریں۔ ایسے موقعے پر "اردو سندھی بلوے" کی نوبت نہیں آتی۔ بلکہ برسوں مل جل کر رہنے اور کاروبار کرنے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ جن کی مادری زبان اردو ہے وہ بے تکلف سندھی بولتے ہیں اور سندھی بولنے والوں کو اردو کے فقرے ادا کرتے ہوئے حجاب نہیں آتا۔

لیل و نہار نے ۱۴ ستمبر کے شمارے میں زبان کے مسئلہ پر اپنے موقف کو ان الفاظ میں واضح کیا تھا۔

"اگر کسی پاکستانی کی مادری زبان اردو ہے تو یہ اس کا گناہ نہیں اور اگر سندھی ہے تو اس کی خطا نہیں، اس صورت میں اگر اردو اہل زبان کا ایک طبقہ مشرقی پاکستان میں یا سندھ میں جا بسا ہے اور بلوچی آبادی کے ایک حصے کی زبان پشتو ہے تو آپ ان اقلیتوں سے یہ مطالبہ تو کر سکتے ہیں۔ کہ وہ اپنے وطن کی زبان اور تہذیب سے لگاؤ اور آشنائی پیدا کریں.... لیکن لسانی اور تہذیبی اختلاف کی بنا پر نہ کسی اقلیت کے خلاف تعصب جائز ہے، نہ کسی اقلیت سے یہ مطالبہ جائز ہے کہ وہ اپنی زبان یا تہذیب سے دستبردار ہو جائے۔"

اردو اور سندھی کا تنازعہ پیدا کرنے والے ہر دو فریق سے ہماری گذارش ہے کہ ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، اور اگر عوام کے مسائل میں کمی نہیں کر سکتے، تو ان میں اضافہ تو نہ کریں۔

واپس آنا پیر صاحب کا، سیاست سے صحافت میں

پیر علی محمد راشدی صحافت میں واپس آگئے، ویسے کچھ زیادہ دور نہیں گئے تھے بس یہی الیکشن درپیش تھا، پیر صاحب کہتے ہیں کہ الیکشن میں جس جنس کی ضرورت تھی، وہ میرے پاس موجود ہی نہ تھی، میں سوشلسٹ نہیں تھا، میرے پاس سرمایہ نہیں تھا، پارٹی نہیں تھی، میں یہ وعدہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں زید کی زمین یا جائیداد زبردستی چھین کر عمرو کے حوالے کر دوں گا۔" لے دے ایک زرِ ضمانت پاس تھا، سو بہ عجلت تمام ضبط کرا آئے۔ع

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

صحافت پیر صاحب کا ریٹائرنگ روم ہے، جب سیاست سے تھک جاتے ہیں تو یہیں آکر دم لیتے ہیں اور جب اپنے مضامین کی تکرار سے جی اکتا جاتا ہے تو قلم رکھ کر باہر نکل کھڑے ہوتے ہیں، اب کے ذرا دیر سے واپسی ہوئی، اس دوران میں انہوں نے قرطاس و قلم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک تو انتخابی مہم کے دوران میں فرصت ہی کہاں تھی، دوسرے الیکشن میں زبانی وعدے اچھے ہوتے ہیں آدمی لکھے کیوں جو بعد میں پکڑا جائے، بارے اب فرصت ہے انتخابات پانچ سال تک تو یوں بھی نہیں ہونے اور ہوں بھی تو اس عرصے میں سندھ کے جاگیرداروں کی روایتی سیاست کا جنازہ نکل چکا ہوگا۔ لہٰذا اب یوں سمجھئے کہ صحافت میں پیر صاحب کی یہ واپسی مستقل ہے۔

لیکن الیکشن میں پیر صاحب کی شرکت کا اصل سبب انہی کی زبانی سنئے، لکھتے ہیں۔

اصل سبب یہ تھا کہ خاکسار نظریۂ پاکستان کی ولادت کے وقت موجود رہا تھا۔ اور اب جب اس برخوردار کی میت اُٹھ رہی تھی تو اس کو کاندھا نہ دینا اور اس کے سوگواروں کی جماعت میں شامل نہ ہونا۔ وضعداری کے خلاف تھا۔

پیر صاحب کی وضعداری کے ہم پہلے بھی قائل تھے اب کچھ زیادہ قائل ہو گئے ہیں۔ ایک مشاعرے میں مولانا چراغ حسن حسرت کو شاعروں کے معمول کے تقاضوں کے تحت اس قدر مصرعے پے در پے اٹھانے پڑے کہ مرحوم کے ہاتھ شل ہو گئے، کہنے لگے "صاحب کیا کریں اپنی تو ساری عمر مصرعے اٹھاتے اور مُردوں کو کاندھا دیتے گذری ہے۔ بہر حال پیر راشدی سے ہمیں ہمدردی ہے، ویسے انہوں نے یہ اچھا کیا کہ "نظریۂ پاکستان" کے پہلو میں اپنے سیاسی کیریئر کا جنازہ بھی، چپکے سے دفن کر آئے۔

کراچی میں قیام پاکستان کے وقت ایک اخبار سندھ آبزرور ہوتا تھا۔ اس وقت تک اخباروں میں اگرچہ گورکنوں اور کاندھا دینے والوں کی اسامی پیدا نہیں ہوئی تھی، لیکن پیر صاحب آخر اس اخبار کے مدیر شہیر تھے، لہٰذا انہوں نے اس صحیفہ کے جنازے کو دور تک کاندھا دیا، بلکہ لحد میں اتار کے الگ ہوئے، اس سے پہلے پیر صاحب کچھ اور اخباروں کو ٹھکانے لگا چکے تھے۔

سیاست میں پیر صاحب مردِ آہن ایوب کھوڑو کے مشیر اور دستِ راست تھے۔ مردِ آہن اب تو خیر سے زنگ خوردہ ہیں، لیکن جن دنوں اقتدار میں تھے شمشیرِ برہنہ تھے۔ دونوں بزرگوں میں تقسیم کار کی صورت یہ تھی کہ ایک بڑھ کر وار کرتا اور حریف کو ٹھکانے لگاتا تھا۔ دوسرا تجہیز و تکفین کی رسوم بجا لاتا اور کاندھا دیتا تھا۔ سندھ میں پیر الٰہی بخش کی وزارت کو کاندھا دینے والے پیر صاحب، پھر پیر زادہ عبدالستار کی وزارت کو کاندھا دینے والے پیر صاحب، یہاں تک سندھ اسمبلی کو لحد میں اتار کر اس پر ون یونٹ کا گنبد تعمیر کرانے والے پیر صاحب، اس لحاظ سے پیر صاحب کا تجربہ اتنا وسیع اور پرانا ہے کہ کوئی سلیقے کی حکومت ہوتی تو ایک الگ وزارت، کفن دوزوں، گورکنوں، غسل اور کاندھا دینے والوں کی تیار کرتی اور پیر صاحب کو اس وزارت پر مامور کرتی، لیکن جیسا کہ پیر صاحب نے اپنے اس مضمون میں لکھا ہے "ابھی تو مستقبل کے حالات غیر یقینی ہیں۔ آئین کیسے بنتا ہے اور حکومت کیونکر قائم ہوتی ہے"، یہ مسائل طے ہونے باقی ہیں۔

پیر راشدی کو اس بات کا بڑا صدمہ ہے کہ "سیاسی اثر کے پُرانے اور روایتی مرکز اب بالکل بیکار ہو چکے ہیں۔ مثلاً مولوی اور پیر صاحبان، وڈیرے، چودھری، رئیس، قومی سردار، برادریاں اور ان کے سربراہ سیاسی نقطۂ نظر سے اب کسی کام کے نہیں رہے۔"

ضمانت تو اس الیکشن میں اور بھی لوگوں کی ضبط ہوئی ہے، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ پیر شو بیاموز، تو غلط نہیں کہتے۔ نواب زادہ نصر اللہ خاں، پیر ہوتے تو یہ نکتہ سمجھتے، البتہ پیر راشدی نے بھید پا لیا، حالانکہ پیر صاحب تو ایک ہی جگہ سے ہارے تھے، نصر اللہ خاں دو دو جگہ سے ہارے اور کچھ کم بُری طرح نہیں ہارے، شاید ضمانت بھی ضبط ہوئی۔ لیکن کچھ سیکھنا تو کیا تھا، ضمانت کے ساتھ عقل بھی، جو تھوڑی بہت تھی، ضبط کرا بیٹھے، اور اُلٹے قوم کو الزام دینے لگے کہ سبھی نے غلط فیصلہ کیا ہے، میاں طفیل محمد نے بھی کچھ اسی طرح کی بات کہی تھی۔ لیکن ان کا پیرایہ اور تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ دھاندلی بہت ہوئی ہے۔ ظاہر ہے اس سے بڑی دھاندلی اور کیا ہو سکتی ہے کہ میاں طفیل محمد ہار جائیں، جن پر صالحیت، مولانا مودودی کے بعد، اگر کچھ بچ رہی ہے تو وہ ختم ہے، پیر راشدی نے کاندھا دینے والوں میں "سوگواروں کی جماعت" کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے اس جماعت میں نواب زادہ نصر اللہ خاں اور میاں طفیل محمد اور دوسرے اکابر شامل رہے ہوں گے۔ پیر صاحب کو چاہیے کہ "مرحوم" کی دعائے مغفرت کے ساتھ ہی، ان کے لئے صبرِ جمیل کی دعا کریں۔

راشدی صاحب نے انتخابات میں اپنی شکست کا تذکرہ بالکل اس طرح کیا ہے، جیسے یہ تو ہونا ہی تھا۔ اس میں حیرت اور رنج کی بات ہی کچھ نہیں۔ اتنا بے پروا اور سرسری انداز تاریخ میں صرف بڑے بڑے حکمرانوں کو زیب دیتا تھا جو ناکامی کی چوٹ کو گرد کی طرح جھاڑ کر مزے سے اینڈتے پھرتے تھے یا پھر یہ انداز ان سردار صاحب کا تھا، جو غسل خانے سے باہر نکلے تو کسی نے کہا، ابھی ابھی اندر دھماکہ بڑے زور کا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا، کوئی خاص بات نہیں، قمیض فرش پر گر پڑی تھی۔ سوال ہوا قمیض گرنے کا اتنا بڑا دھماکہ! انہوں نے راشدی صاحب کی طرح بے پروائی سے سر کو سہلاتے ہوئے کہا، ہاں قمیض کے اندر میں بھی تھا۔

راشدی صاحب بے نیاز آدمی ہیں۔ فتح و شکست میں ان کے لئے کچھ زیادہ فرق نہیں آتا۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ بے نیازی انتخابات کے بعد ظاہر ہوئی ہے۔ جن دنوں پیر صاحب اپنے انتخابی حلقے میں دورہ کر رہے تھے، کیفیت کچھ اور تھی۔ حواریوں نے چہار جانب فتح کا ڈنکہ پیٹ رکھا تھا، اور سندھ متحدہ محاذ کی وزارت یقینی نظر آ رہی تھی، پیر صاحب، اس کے "وزیر اعلیٰ" تھے۔ احباب۔ پیر صاحب کو متوقع وزارت سازی پر مبارکباد پیش کرتے تھے۔ اور یہ صاحب مسکرا کر انکسار سے سر جھکا لیتے تھے۔ اس زمانے کی اطلاع یہ ہے کہ پیر صاحب بہت سیر چشم اور کشادہ دست ہو گئے تھے، سوالی، ان کے دروازے سے خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا، جس نے راہِ مولیٰ کچھ مانگا، انہوں نے وزارت یا سفارت، اس وقت جو سامنے نظر آئی، پیش کر دی بہت سے لوگوں کو جاگیریں بخش دیں۔ بہتوں کو ملازمتیں دلوانے کا پختہ یقین دلایا، غرضیکہ اتنے وعدے کر لئے کہ آج اپنی ناکامی پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، جان بچی اور لاکھوں پائے، نصیبِ دشمناں کامیاب ہو گئے ہوتے تو مصیبت میں پھنس جاتے۔ سائلوں اور غرض مندوں نے گھیراؤ کر لیا ہوتا۔ شکست کے بعد پیر صاحب کے لہجے میں جو بے پروائی اور بے نیازی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا اصل سبب یہی ہے۔

تعمیری کاموں کے صبر آزما تقاضے

یہ وقت آئین سازی کا ہے

ایک درد مند مسلمان کے قلم سے

خدا کا شکر ہے کہ لاہور میں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ سے متعلق یکایک جو پیچیدہ اور اضطراب افزا صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اختتام کو پہنچی اور اسکے لئے وہ حضرات بھی مستحق تشکر ہیں جنہوں نے اپنے تصور کے مطابق مظلوموں کی حمایت میں قدم اٹھایا تھا، اگرچہ کسی کو ان کے نقطۂ نگاہ اور طرز عمل سے کتنا ہی اختلاف ہو

پاکستان کے مختلف دوائر میں جو تشویش انگیز خرابیاں نظر آرہی ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جس کا ازالہ جلد سے جلد نہ ہونا چاہیئے۔ ابتدا ہی سے دیوار کی تعمیر میں کجی پیدا ہو جائے تو دیوار کو کتنا ہی اونچا لے جائیں اس کی کجی برابر باقی رہے گی اور اسکی استواری کو لازماً محل نظر قرار دیا جائے گا۔ ہمارے ہاں قائداعظم کے انتقال سے تھوڑا ہی عرصہ بعد ایسی قوتیں بروئے کار آگئی تھیں، جنہیں بظاہر پاکستان کی صحیح تعمیر یا اہل پاکستان کی بہبود سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر ہر دائرے میں تخریب کا ایک لامتناہی عمل شروع ہو گیا اور ہماری مہلت تعمیر و اصلاح کے بہترین اوقات برباد ہو گئے۔

اب ایک خرابی، ایک نقص اور ایک کجی نہیں، جس کا دور کرنا ضروری ہے۔ ایک دنیا ہے جو اصلاح کی طلبگار ہے۔ اس کا طریقہ کیا ہے؟ یہ کہ جو جو بڑی چھوٹی خرابیاں مختلف دوائر میں موجود ہوں۔ ان کی فہرستیں مرتب کر لی جائیں۔ مقامی اصحاب یہ بھی سوچ لیں وہ خرابیاں کیونکر دور کی جا سکتی ہیں اور حکومت بنتے ہی حکومت کے ذریعے سے انہیں ختم کیا جائے۔ کیوں؟ اس لئے کہ عوامی اور انتظامی معاملات میں خرابیوں کے ازالے کی ذمہ دار حکومت ہی ہوتی ہے، عوام یا عوام کے نمائندے نہیں ہوتے۔ عوام کے نمائندوں کا فرض یہ ہے کہ اپنے حلقۂ نمائندگی کی تمام خرابیوں کا پورا پورا جائزہ لیں اور برابر لیتے رہیں اور تمام معاملات مقامی افسروں یا ذمہ دار سیکرٹریوں اور وزیروں کے سامنے پیش کر کے ازالہ کرائیں یا قانون ساز مجلس میں انہیں پیش کر کے فیصلے صادر کرائے جائیں۔

اس کے سوا جو کچھ کیا جائے گا، اسے کوئی بھی درست قرار نہ دے گا۔ یہ نظم نہیں بلکہ بدنظمی کا راستہ ہو گا اور جس ملک میں بدنظمی کو فروغ دیا جائے گا۔ وہاں نظم کا تصور محال ہو جائے گا۔

اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ کون فیصلہ کرے۔ فلاں طریقہ نظم کا ہے اور فلاں بدنظمی کا؟ فرض کیجئے کہ میرے نزدیک یا میرے ہمنواؤں کے نزدیک ایک بات خلاف حق و انصاف ہے۔ کیا اسے لازماً حق و انصاف کے خلاف قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ فیصلہ تو بہرحال رائج الوقت حکومت ہی کا قائم کردہ نظام کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا نقطۂ نگاہ وہ نہ ہو جو میرا اور میرے ہمنواؤں کا ہے۔ پھر فیصلہ اور کس کا چلے گا؟ میرا یا رائج الوقت حکومت کا؟ اگر رائج الوقت حکومت کو تقدم حاصل ہے جیسا کہ لازماً ہے تو اس حکومت کو بدلنے کے لئے تحریک چلائی جا سکتی ہے اسے غیر منصف، خود غرض اور حق ناشناس قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اہل وطن کی فلاح و بہبود کے خلاف جا رہی ہے، جیسا کہ صدر ایوب کی حکومت کے خلاف مظاہروں میں کہا گیا۔ لیکن یہ درست نہیں کہ ہر فریق جہاں کوئی چیز اپنی مرضی کے خلاف دیکھے، وہاں اپنے حسب منشا عمل شروع کر دے۔ یہ کھلی ہوئی بدنظمی ہو گی، جو ملک کے لئے ایک بڑی سے بڑی حکومت سے بھی زیادہ نقصان رساں ہے۔ ہاں اس حکومت کو بدلنے کے لئے کوئی بھی آئینی طریقہ اختیار کر لینا بالکل جائز ہے اور مظاہرے یقیناً آئینی طریقہ اظہار اختلاف ہیں۔ مگر نفس حکومت کے خلاف اور اسے بدلنے کی غرض سے، نہ کہ مختلف معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق درست کرنے کے لئے۔ جمہوری نظام میں پارلیمنٹ یا قانون ساز مجلس حکومتیں بدلوا سکتی ہیں۔

جن اصحاب نے کسی معاملے میں شدت احساس کے ساتھ بطور خود اصلاحی قدم اٹھانا مناسب سمجھا، ان کے جذبۂ ہمت اور کمال ایثار کی جتنی ستائش کی جائے کم سمجھی جائے گی۔ تاہم ان کے اختیار کردہ طریقے سے یقیناً اختلاف کیا جائے گا۔ کیونکہ انہوں نے ہزاروں خرابیوں میں سے ایک کو لیا اور ظاہر ہے کہ ہر خرابی کو دور کرنے کے لئے جابجا اس قسم کے طریقے اختیار نہیں کئے جا سکتے۔ کئے جائیں گے تو تمام خرابیوں کے ازالے تک حکومت کا ہر کام لازماً معطل رہے گا اور جو خرابیاں دور ہونگی وہ اپنے پیچھے ایک غیر متوازن صورت حال چھوڑتی جائیں گی۔ وجہ یہ ہے کہ خرابیوں کا ازالہ منظم طریق پر نہ ہوا بلکہ غیر منظم طریق پر ہوا اجتماعی طریق پر نہ ہوا بلکہ جزواً جزواً ہوا اور حکومت جس کا یہ کام ہے وہ عملاً معطل رہی اور اس کا کام محض یہ رہ گیا کہ مختلف مقامات کے اصحاب جہاں ہنگامے کی صورت پیدا کریں وہاں ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جائیں یا انہیں پکڑ پکڑ کر جیلوں میں رکھا جائے ذرا سوچئے کہ آیا یہ اس ملک یا کسی ملک کے احوال کی اصلاح کا کوئی مناسب طریقہ ہے؟

پھر جو انتخابات ہوئے، ان میں سب سے پہلا اور اہم ترین کام یہ ہے کہ ملک کا دستور بنے۔ اس کے لئے اطمینان سے تمام طبقات ملک کو بنیادی امور و معاملات کے متعلق ہمنوا بنانے کا مسئلہ سب سے پہلے آتا ہے تاکہ دستور سازی کا کام جلد سے جلد مکمل ہو جائے اور مرکزی و صوبائی حکومتیں جمہوری نظام کے مطابق کارفرمائی شروع کر دیں تاکہ ہر حلقے اور علاقہ کی ضروریات کے مطابق اصلاحی اور فلاحی کاموں اور پروگراموں کا آغاز ہو سکے۔ عوام سے جو وعدے انتخابات کے دوران میں کئے گئے ان کے ایفا کا کوئی عملی مرقع سامنے آجائے۔ جب تک یہ نہ ہو گا عوام ان تکلیفوں سے کیونکر محفوظ ہوں گے۔ جو خدا جانے کب سے ان کے لئے عذاب الیم کا سرچشمہ بنی ہوئی ہیں؟

اصل کام یہ تھا کہ ہر صاحب علم و عمل ہمہ تن دستور سازی کے مسئلے پر متوجہ ہو جاتا اور ہر کام کو دستور سازی کی تکمیل پر ملتوی رکھا جاتا۔ ہاں اس اثنا میں ہر بڑے یا ہر چھوٹے گروہ کے لئے لازم تھا کہ وہ اپنے اپنے حلقے میں پھر پھر کر اولاً خرابیوں کی فہرست مرتب کرتا۔ ثانیاً یہ اندازہ کرتا کہ مصیبت زدہ عوام کی امداد کے لئے جو منصوبے پیش نظر ہیں۔ انہیں لباس عمل پہنانے کے لئے کچھ مطلوب ہو گا؟ مثلاً ہر کاشتکار خاندان کے لئے گزارے کے مطابق زرعی زمین مہیا کی جائے تو پورے حلقے میں کتنے ہزار یا کتنے لاکھ ایکڑ زمین مطلوب ہو گی؟ اس طرح کے جائزوں سے خرابیوں نیز ان کے ازالے کی صورتوں کے بارے میں ایک سرسری نقشہ سامنے آجاتا۔ اب بھی صحیح، مفید اور اصلاحی منصوبوں پر عمل پیرائی کے لئے ایسے ہی بنیادی کام ضروری ہیں۔ مختلف مقامات پر محدود خرابیوں کے ازالے کے لئے تحریکیں شروع کر دینے سے اصل کام بہت پیچھے پڑ جائے گا۔ اور کوئی بھی ذمہ دار فرد کل ایسی جزوی تحریکات کا نقشہ ہاتھ میں لے کر اصل کام نہ کر سکنے کے باب میں عوام کے سامنے عذرخواہ نہ بن سکے گا۔ نیز فرض کیجئے کہ کل آپ کی حکومت بن جاتی ہے۔ آپ فرشتے نہیں انسان ہیں۔ غلطیاں اور فروگزاشتیں کر سکتے ہیں۔ کیا کل دوسرے گروہ یہی طریقہ اختیار کریں گے تو آپ کیا کر سکیں گے؟ اس طرح تو آپ اپنے خلاف کارروائی کی مثالیں پیش کرتے جا رہے ہیں؟

بہادروں اور جان کی بازی لگا دینے والوں کی قدر و منزلت کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ مگر ہر کام کا موقع اور محل مناسب وقت اور فطری و طبعی ترتیب کا معاملہ نظر انداز نہ ہونا چاہیئے۔ نیز طبیعتوں میں تحمل، بردباری اور حلیمی پیدا کرنی لازم ہے۔ کیونکہ داعیان اصلاح کے اولین اوصاف میں پارٹی ہی نہیں، افراد کے وقار کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جزو اور کل کے حدود کا پورا خیال رکھا جائے، اور حکومت کے کاموں کو گروہی کام بنانے سے احتراز کیا جائے۔ حقیقتاً نتیجہ خیز کام وہی ہوتا ہے جس میں تمام حدود کی نگہداشت ٹھیک ٹھیک ملحوظ رہے۔

کچھ دیر جوشؔ صاحب کے ساتھ



"جس ذہنی انقلاب کا میں تمنّائی ہوں

وہ ابھی رونما نہیں ہوا"

جوشؔ

جناب جوشؔ ملیح آبادی ایک یگانۂ عصر شاعر ہی نہیں، ایک خوش فکر اور صاحبِ طرز انشا پرداز بھی ہیں جس کا ثبوت اُن کی تازہ تصنیف "یادوں کی برات" ہے۔ یہ تصنیف عنقریب دستیاب ہونے لگے گی۔ لیل و نہار کے نمائندۂ خصوصی نے زیرِ نظر مضمون میں جوشؔ صاحب سے اپنی ملاقات کی رُوداد قلم بند کی ہے۔

ایسی شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں جو نہ صرف اپنے دور کو متاثر کرتی ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے فکر و نظر کے نئے جادے ہموار کرتی ہیں اور بزمِ حیات کو منوّر کرنے کے لیے سوچ کی نئی شمعیں جلاتی ہیں۔ حضرت جوشؔ ملیح آبادی اس صدی کی اُن گنی چنی اور نادرۂ روزگار شخصیتوں میں سے ایک ہیں جو گزشتہ پچاس سال سے سینہ ٹھونک کر جان بلب قدامت پرستی کو ٹھکرا رہے ہیں اور نئی نسل کو منزلِ مراد پر پہنچنے کی راہ دکھا رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ شروع ہی سے برّ صغیر کی ایک انتہائی نزاعی شخصیت رہے ہیں اور ایک یہ بات بھی اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔ انھوں نے تنگ مزاج شہر یارانِ وطن اور شعلہ خو مفتیانِ شرعِ متین کی پروا کئے بغیر جس بات کو سچ اور حق سمجھا برملا کہا اور بیچ کھیت کہا۔ بعض اوقات اس حق گوئی کی اُنہیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

حضرت جوشؔ نے اپنے خیالات، مشاہدات اور تاثرات کو بالعموم نظم کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس لئے جب یہ خبر عام ہوئی کہ حضرت جوشؔ ملیح آبادی اپنی خود نوشت سوانح عمری "یادوں کی برات" کے عنوان سے مرتب کر رہے ہیں اور اُس کے اقتباسات بعض اخبارات و رسائل کی زینت بنے تو اُن کے شیدائیوں اور برِّ صغیر کی سماجی، سیاسی اور ادبی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھنے والوں میں اس کتاب کی اشاعت کا اشتیاق بڑھا۔ حضرت جوشؔ کی ادبی زندگی کی عمر تقریباً ۶۰-۶۵ سال ہے اور اُن کی مجلسی زندگی اُسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب سے اُنہوں نے ہوش سنبھالا۔ بہت سے اہم واقعات اُن کی نظروں کے سامنے رونما ہوئے اور بہت سے واقعات کے حالات اُنہیں اُن لوگوں سے معلوم ہوئے جنہوں نے خود مشاہدہ کیا تھا۔ اُن کے دوستوں، پرستاروں، حریفوں اور ملاقاتیوں کا حلقہ وسیع اور متنوع بھی ہے جن میں اس دَور کی بہت سی عظیم شخصیتیں شامل ہیں، اس لئے یہ توقع بیجا بھی نہیں کہ جوشؔ کے بیباک قلم نے بعض ایسی حقیقتیں بے نقاب کی ہوں گی جن پر اب تک پردے پڑے ہوئے تھے۔ اب چونکہ حضرت جوشؔ کی یہ معرکۃ الآراء تصنیف جو اُن کی خود نوشت سوانح بھی ہے اور اس دَور کی ایک مستند تاریخ بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ حضرت جوشؔ سے ملاقات کی جائے اور اس کتاب کے بارے میں اُن سے گفتگو کی جائے۔ میں نے ٹیلیفون پر اپنا مدّعا بیان کیا۔ اُنھوں نے ازراہِ شفقت مجھے وقت اور دن دے دیا۔ میں مقررہ روز کچھ تاخیر سے پہنچا تو اُنہیں مضطرب پایا۔ یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ جوشؔ صاحب ہمیشہ سے وقت کے سخت پابند ہیں۔ اُن کی زندگی کا پورا نظام گھڑی کی سوئی کا پابند ہے، پھر میں اُن کے قریب بیٹھ گیا اور کسی رسمی تمہید کے بغیر گفتگو شروع کر دی۔

میں نے پوچھا۔ آپ کی تصنیف یادوں کی برات آپ کی دیگر تخلیقات کے مقابلے میں اس لئے بڑی اہم ہے کہ یہ آپ کی پوری زندگی پر محیط ہے جبکہ دیگر تخلیقات کو یہ خصوصیت حاصل نہیں اس لئے یہ فرمائیے کہ "یادوں کی برات" کے بارے میں خود آپ کی کیا رائے ہے؟

"اس سلسلے میں بہت کچھ تو میں نے کتاب کے شروع میں لکھ دیا ہے یقیناً وہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ اس کے علاوہ مصنّف سے یہ بات نہ پوچھئے۔ عامۃ الناس سے دریافت کیجئے۔ جس طرح دُنیا کا ہر باپ اپنے کالے کلوٹے بچّے کو بھی چندے آفتاب چندے ماہتاب کہتا ہے اُسی طرح ہر مصنّف کو اپنی تصنیف اچّھی لگتی ہے۔"

یادوں کی برات

میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کتاب کے IMPACT کے بارے میں خود جوشؔ صاحب کا کیا اندازہ ہے اس لئے میں نے اُن سے اس براہِ راست سوال کرنے کے بجائے یہ پوچھا "کیا آپ کی یہ تصنیف دیگر شعری تخلیقات کی طرح نئی نسل کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی؟"

"میں شاعر بھی ہوں کہ نہیں، میری شاعری اعلیٰ ہے کہ ادنیٰ اس سے قطعِ نظر، میں سمجھتا ہوں کہ میری شاعری

نے نژادِ نو پر ضرور اثر ڈالا ہے۔ لیکن جس ذہنی انقلاب کا میں متمنی ہوں، وہ رونما نہیں ہوا ہے۔ لوگ میرے طرزِ بیان سے تو ضرور متاثر ہیں لیکن میرے خیالات کو ابھی قبولیتِ عام حاصل نہیں ہوئی۔ اب رہی "یادوں کی برات" تو اس میں رُشد و ہدایت کی کوئی سعی کارفرما نہیں ہے۔ البتہ میری زندگی کے واقعات اور اُن کے رَدِّ عمل پر غور کر کے بہت کچھ سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے اپنی زندگی کے بیشتر واقعات کو خواہ وہ گفتنی ہوں یا ناگفتنی اس میں بلاکم و کاست سمو دیا ہے"؟۔ میں نے پوچھا۔

جی۔ میں نے گفتنی و ناگفتنی واقعات "کھول کر بیان کر دیئے ہیں۔ اظہارِ حالات پر شرمایا نہیں! اور کیوں شرماتا، میری قوم کا تمدّن ایک وسیع حمام ہے، میں اپنی پوری قوم کے ساتھ اس وسیع حمام میں بیٹھا ہوا ہوں، حمام میں سب ننگے ہیں، جھینپنے کیا۔ ہاں اپنے ایک ایڈوکیٹ دوست کے اس خوف کی بنا پر، کہ کہیں یہ کتاب عریاں نویسی کی بنا پر ضبط نہ کر لی جائے، میں نے اپنی برہنہ گفتاری کی دھار کو کُند کر کے قلم اُٹھایا ہے۔"

محض حافظے کی مدد سے

"اچھا یہ فرمائیے کہ آپ نے "یادوں کی برات" میں جو واقعات درج کئے ہیں وہ آپ نے حافظہ کی مدد سے تحریر کئے ہیں یا تحریری یادداشتوں کی مدد سے"۔

میں نے اپنی زندگی کے کسی دَور میں بھی روزنامچہ نہیں رکھا روزنامچہ تو روزنامچہ میں نے اپنی نظموں کے وہ ترجمے تک احتیاط سے نہیں رکھے جو آنجہانی ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور مسز سروجنی نائیڈو نے کئے جن کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تلف ہو گئے۔ یہ تمام کتاب حافظے اور یاس پاش حافظے پر زور دے کر مرتّب کی گئی ہے جو کچھ یاد آ گیا لکھ دیا جو بھول گیا وہ رہ گیا۔

میں نے دبی زبان سے عرض کیا۔ "جوش صاحب اس میں غلطی کا بھی احتمال ہو سکتا ہے"؟

اس حد تک تو غلطی ممکن ہے کہ واقعات کی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو یعنی جو واقعہ پہلے رونما ہوا تھا اُس کا تذکرہ بعد میں کیا گیا ہو یا جو بعد میں رونما ہوا تھا اُس کا تذکرہ پہلے آ گیا ہو۔ یہ بات میں نے "یادوں کی برات" کے شروع میں بھی لکھ دی ہے یا کوئی نام غلط دیا ہو مثلاً جہاں میں نے اپنے عزیز دوست حکیم صاحب عالم مرحوم کا تذکرہ کیا ہے وہیں اُن کے دو چھوٹے بھائیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُن میں سے ایک بھائی کا نام محمد نواب تو صحیح لکھ دیا لیکن دوسرے بھائی کا نام غلطی سے لڈن صاحب لکھ گیا۔ حالانکہ اُن کا اصلی نام اعظم قدر عرف بڈھن صاحب تھا اور وہ بھی مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز تھے۔ جب کتاب چھپ کر آئی تو اپنی یادداشت پر لعنت ملامت کرنے لگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اہم واقعات حافظہ سے اوجھل ہو گئے ہوں اور وقت پر یاد نہ آئے ہوں لیکن جو واقعات درج کئے گئے ہیں وہ من و عن صحیح ہیں۔ آدمی بھُول تو سکتا ہے لیکن بھُول کر جھوٹا واقعہ نہیں لکھ سکتا۔

جوش صاحب کو اپنا کلام یاد نہیں

"آپ کی یادداشت کا یہ عالم ہے تو آپ کو اپنا بیشتر کلام بھی یاد نہیں ہو گا"۔ میں نے پھر جسارت کرتے ہوئے پوچھا۔

بیشتر کیا گنے چُنے چند اشعار کے سوا کچھ بھی نہیں یاد۔ اس سلسلے میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔

ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ میں اُن سے واقف نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا، فرمانے لگے، میں بھی کچھ عرصے سے اُسی "زلفِ گرہ گیر" کا اسیر ہو گیا ہوں جس کے اسیر میر و غالب و مومن تھے اور آپ بھی ہیں۔ میری بدقسمتی کہ آپ سے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہوا۔ ایک آدھ نظم سنا کر آپ سے رائے لینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا۔ ارشاد۔ انہوں نے نظم سنانا شروع کی، میں نظم سنتا رہا جو اشعار مجھے پسند آئے ان کی داد بھی دی۔ وُہ بزرگ نہایت انکساری کے ساتھ داد بھی وصُول کرتے رہے جب نظم ختم کی میں نے اُن کی بہُت تعریف کرتے ہوئے کہا۔ صاحب آپ کے کلام میں بڑی پختگی ہے۔ سبحان اللہ۔ جب وُہ مزید داد بھی سمیٹ چکے تو مسکرا کر فرمانے لگے۔ حضور یہ آپ ہی کی نظم ہے۔ فلاں سنہ میں فلاں رسالہ میں چھپی تھی، میں نے محض ڈرامہ کیا تھا۔ میں خود بھی بڑی دیر تک اُن کی اس حرکت پر محظوظ ہوتا رہا۔

میں نے پوچھا واقعی آپ کو یاد نہیں رہا تھا کہ وُہ نظم آپ کی نہیں ہے یا محض اس وجہ سے کہ ان کا دل نہ ٹوٹے آپ یہ تاثر دے رہے تھے کہ آپ نہیں سمجھے۔

نہیں جناب۔ مجھے مطلق یاد نہیں تھا کہ یہ نظم میری ہے اور میں واقعی اُنہی بزرگ کی نظم سمجھ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ اچھا آپ کو اتنا تو یاد ہو گا کہ آپ نے کم از کم کتنے شعر کہے ہیں۔

نہیں مجھے بالکل نہیں یاد۔ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ میرے مجموعوں کی تعداد ۱۸ - ۱۹ ہے۔ ان تمام مجموعوں کے نام بھی میں شاید ایک وقت نہ بتا سکوں۔ ایک نیا مجموعہ جو ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، زیرِ تکمیل ہے۔

اس کتاب کی تصنیف یا تالیف کا خاکہ آپ کی خلّاقیِ طبع کا ممنونِ احسان ہے یا دوسری خود نوشت سوانح مثلاً سر سیّد رضا علی مرحوم کے "اعمالنامہ" یا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے "تذکرہ"، وغیرہ سے متاثر ہو کر آپ نے اسے ترتیب دیا ہے"؟

دنیا کی کسی سوانح عمری سے متاثر ہو کر میں نے یہ کتاب نہیں لکھی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے جی چاہا اپنے حالات قلمبند کر دوں، سو کر دیئے۔

کیا پاکستان میں اُردو زبان کو عام کرنے اور ترقی دینے کے لئے آپ اس خیال کے حامی ہیں کہ اُردو میں علاقائی زبانوں کے الفاظ کو استعمال کیا جائے؟

جی۔ یہ فقط پاکستان میں اُردو کو فروغ دینے ہی کی بات نہیں۔ خود زبانِ اُردو کے حق میں یہ بات بہت ضروری ہے۔ اُس کے احاطے میں، پاکستانی صوبوں کی زبانوں ہی کے نہیں بلکہ کرۂ ارض کی تمام زبانوں کے وہ تمام الفاظ داخل کر لئے جائیں جن کے مترادفات اُردو میں نہیں ہیں یا جن کے استعمال سے اظہارِ خیالات میں آسانی پیدا ہوتی، یا زورِ بیان میں اضافہ ہوتا ہے۔

جوش صاحب ایک بات اور فرمایئے۔ اُردو میں تذکیر و تانیث کا مسئلہ ہمیشہ سے پیچیدہ اور نزاعی رہا ہے جس کی وجہ سے بالخصوص اُن افراد کو جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے، اُردو لکھنے اور بولنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ان حالات میں کیا یہ ضروری نہیں کہ تذکیر و تانیث کے اصُولوں کو آسان بنایا جائے مثلاً غیر جاندار اشیاء کے لئے تذکیر و تانیث کا کوئی ایک صیغہ مقرر کر لیا جائے یہ نہ ہو کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ قلم ٹوٹ گئی دوسرا کہہ رہا ہے قلم ٹوٹ گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

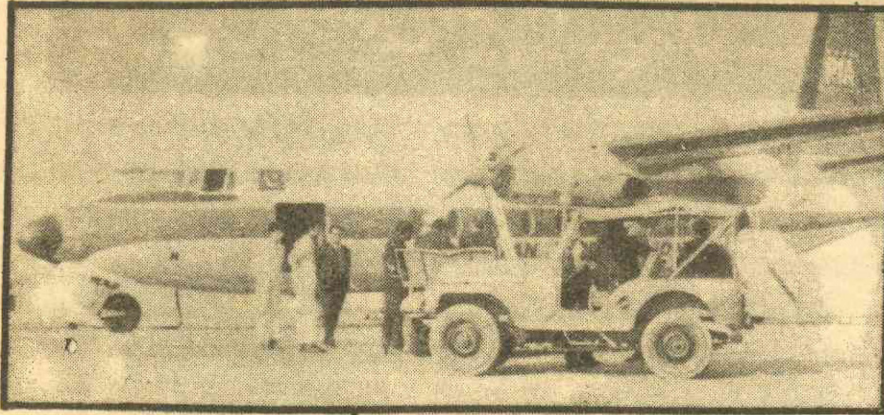
نظم و نثر، دونوں میرے لئے پانی ہیں

""تذکیر و تانیث کی الجھنیں دُنیا کی اور زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں کسی منطقی اصُول کو دخل نہیں ہوتا بلکہ یہ کلیتہً ایک سماعی مسئلہ ہے جس میں فصحار کے بیان کی پابندی کی جاتی ہے اس لئے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ آدمیوں کے مانند الفاظ میں تبدیلی نہیں ہوا کرتی۔

میں نے اُن سے آخری سوال یہ پوچھا۔ آپ کو اپنے تاثرات اور خیالات کے اظہار میں نظم و نثر میں سے کس میں زیادہ سہُولت ہوتی ہے۔"

"نظم ہو یا نثر دونوں میدان میرے لئے پانی ہیں۔"

اب دیر کافی ہو چکی تھی۔ ہم دونوں بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دونوں ہی کی نظریں آفتاب کی جانب تھیں میں چاہتا تھا کہ آفتاب غرُوب ہونے سے پہلے روانہ ہو جاؤں اور غالباً جوش صاحب اس فکر میں تھے کہ آفتاب جلد غرُوب ہو تاکہ ان کی رات جلد طلوُع ہو سکے۔ میں اس دور کے عظیم شاعر اور انسان سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔



ہڑتال کے باوجود،
بیشتر پروازیں
معمول کے مطابق
جاری رہیں

"لیڈروں" نے اپنے مفاد کی خاطر ملازموں کے مستقبل کو داؤں پر لگا دیا

یونین کی زندگی کے لئے
یہ ہڑتال بہت ضروری تھی
پیاسی کے صدر کا اقرار

یہ ۱۹ر جنوری کی صبح کا ذکر ہے۔ پیر کا دن تھا۔ صبح کوئی ساڑھے آٹھ بجے، ہوائی اڈے پر پی آئی اے کی عمارت کے سامنے قومی فضائی کمپنی کے ملازموں نے ایک مظاہرہ کیا۔ اسی روز شام کو، پیاسی کی طرف سے اخبارات کے لئے ایک اعلامیہ جاری ہوا، جس میں مظاہرین کی تعداد ساڑھے پانچ ہزار بیان کی گئی تھی۔ بیشتر کو ابتدا میں یہی معلوم نہ تھا کہ وہ مظاہرہ کیوں کر رہے ہیں، لیکن پیاسی کے صدر اور دوسرے عہدیداروں نے ملازموں کو اپنے ساتھ مظاہروں میں شرکت پر مجبور کر لیا اور انھیں اس "سنگین صورت حال" سے باخبر کیا، جو نئے اوقات کار کے نفاذ اور یونین کے تین عہدیداروں کی برطرفی سے پیدا ہو گئی ہے۔ پیاسی کے ایک عہدیدار نے تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"آج ہم مالکان کی حیثیت سے اپنے ملازم ڈائرکٹر ایڈمنسٹریشن کو وارننگ دیتے ہیں کہ وہ ہمارے مطالبات منظور کر لیں، ورنہ ہم انھیں برطرف کر دیں گے۔"

ایک اور عہدیدار نے للکارا:۔

"آج ہم نے مزدوروں کی عدالت لگائی ہے، جو ڈائرکٹر ایڈمنسٹریشن اور دوسرے بدعنوان افسروں کے مقدمات کا فیصلہ کر کے انھیں سزا دے گی۔"

لیکن ہوا یہ کہ ہڑتال کے چھٹے روز مزدوروں کی ایک بڑی تعداد اپنے کام پر واپس جا چکی تھی۔ بیشتر پروازیں بحال ہو چکی تھیں، تمام شعبوں میں معمول کی سرگرمیاں جاری تھیں، اور شکست خوردہ ہڑتالی لیڈروں کے بھیجے ہوئے نام نہاد مزدور رہنما انہی افسروں سے انصاف کی بھیک مانگ رہے تھے، جنھیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے چھ روز پہلے پیاسی نے "مزدوروں کی عدالت" لگائی تھی۔ اس ایک ہفتے میں یہ پہلا دن تھا جب پیاسی کا کوئی جلسہ نہ ہو سکا، کیونکہ بقول ان کے ایک عہدیدار کے "آج اتوار ہے، مجمع اکٹھا نہ ہو سکا۔"

مظاہرے کے بعد اچانک ہڑتال

۱۱ر جنوری کا دن گزر گیا، ۱۱ر اور ۱۲ر جنوری کی رات میں کوئی ایک بجے پیاسی نے ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اس کے لئے انتظامیہ کو کسی طرح کا نوٹس دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ۱۲ر جنوری کی صبح کو ہڑتال کا باضابطہ آغاز ہو چکا تھا۔ پیاسی کے کارکن پی آئی اے کی حدود میں فرعون بے سامان کی صورت دندناتے پھر رہے تھے۔ ان کی اشتعال انگیز تقریریں آگ لگا رہی تھیں، لیکن انتظامیہ خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ پیاسی کے کارکنوں نے ہڑتال کو مؤثر بنانے کا پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا۔ وہ جگہ جگہ ناکوں پر ٹولیوں کی صورت میں ڈٹے ہوئے تھے، تاکہ کسی کو کام کے قریب پھٹکنے نہ دیں۔ کارکنوں کی ایک بڑی تعداد نے پی آئی اے کے اندر ڈیرہ جما رکھا تھا۔ وہ مختلف شعبوں میں گھس کر کام کرنے والے ملازموں کو حکم دیتے "چھوڑو کام نکلو باہر" وہ غیر معین عرصے کی ہڑتال کی خبر سناتے اور پیاسی کے فیصلے سے اختلاف کرنے والوں کو "عبرتناک نتائج" کی علانیہ دھمکی دیتے، اور پی آئی اے میں کام کرنے والوں کو معلوم ہے کہ یہ دھمکی خالی نہیں جاتی۔ سفید کالر والے ملازموں پر اس کا خاص طور سے

سب کیا دھرا
آپ ہی کا ہے

بائیں بازو کے اخبارات اور ہفت روزوں نے بار بار اس جانب اشارہ کیا کہ پیاسی کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے اور اس کی وجہ سے پی آئی اے کی ساکھ اور بین الاقوامی وقار کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ مگر اس بے لاگ اور مخلصانہ تنقید پر توجہ نہ دی گئی۔ اور اب جب کہ پیاسی کی بے سبب ہڑتال کی وجہ سے اس قومی ادارے کو شدید نقصان اٹھانا پڑا اور یونین کی ملک دشمنی طشت ازبام ہو گئی تو بالآخر مینجنگ ڈائرکٹر کو اعتراف کرنا پڑا کہ

"اس غیر قانونی ہڑتال کی وجہ سے بے شمار مسافروں کو تکلیف ہوئی، پی آئی اے کی نیک نامی اور ساکھ کو نقصان پہنچا اور خود پی آئی اے کے ملازمین کے مفاد خطرے میں پڑ گئے۔ یہ صورت حال ہر اعتبار سے ناپسندیدہ اور افسوسناک ہے۔"

پیاسی کی اشتعال انگیزیوں سے پی آئی اے کی ساکھ خطرے میں پڑ گئی

اثر ہوا۔ بادلِ ناخواستہ، وہ بھی اپنا کام چھوڑ کر ہڑتال میں شریک ہوتے گئے۔ انتظامیہ نے ان کے تحفظ سے منھ موڑ لیا تھا حالانکہ ایک روز پہلے صبح اور دوپہر کے وقت، مینجنگ ڈائرکٹر مسٹر درّانی کے دفتر کے باہر دو بار مظاہرے ہو چکے تھے جن میں دفعہ ۱۴۴ کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی گئی تھی۔

پیاسی کے عہدیداروں اور کارکنوں کی دہشت گردی اور اشتعال انگیزی ایک طرف اور پی آئی اے کی انتظامیہ کی خاموشی دوسری طرف۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انتظامیہ کیا اپنے گرد و پیش کے حالات واقعات سے یکسر بے خبر تھی؟ کیا اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں؟ اور اگر ایسا نہیں اور اس کی رائے میں ہڑتال غیر قانونی تھی تو اشتعال انگیزی کی روک تھام اور عام ملازموں کی حفاظت کے خیال سے قومی فضائی ادارے کو پہلے ہی روز فوج کی تحویل میں کیوں نہیں دیا گیا؟ آخر ایسا کیوں تھا کہ دفعہ ۱۴۴ کے باوجود پیاسی کے کارکن پی آئی اے کے حدود میں جلسے، جلوس اور مظاہرے کرتے رہے اور انتظامیہ تماشہ دیکھتی رہی۔ باقاعدہ پولیس اور فوج کے پہرے کا انتظام تین دن بعد ۱۴ جنوری کو کیا گیا۔

ہڑتال کیوں کرائی گئی؟

ہڑتال کے دوسرے دن اسٹار گیٹ کے قریب یونین کے دفتر کے باہر پیاسی کے صدر حافظ اقبال نے ہڑتالیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ ہڑتال یونین کی زندگی کے لئے بھی بہت ضروری تھی۔" حافظ اقبال کا یہ اقرار غلط نہیں ہے کیونکہ پیاسی اپنی بدترین کارگزاری اور غلط پالیسی کے سبب زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی ہے۔ ملازمین میں اس کا وقار ختم ہو چکا ہے۔ اکثر ملازم اب اپنا معاملہ یونین کے توسط کی بجائے براہِ راست انتظامیہ کو پیش کرنے لگے ہیں۔ پیاسی کی ساری قوت اور وسائل مخالف یونین کے کارکنوں کو کچلنے اور دبانے میں صرف ہو رہے ہیں۔ مخالف یونین کے کارکنوں اور اختلاف رائے رکھنے والوں کے خلاف آئے دن انتقامی کارروائی کی جاتی۔ پی آئی اے کے اندر انہیں پکڑ کر مارا پیٹا جاتا ہے اور جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ انتظامیہ سے مل کر مخالفین کے تبادلے کرائے گئے ہیں یا انہیں ملازمت سے علیحدہ کرنے کی سازش کی جاتی رہی ہے۔

ریفرنڈم کے بعد ملازمین یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ پیاسی ان کے مفادات کا تحفظ کرے گی۔ ان کے حقوق کی نگہداشت کرے گی اور انتظامیہ کو اس بات کا موقع نہیں دے گی کہ وہ ملازمین کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے مگر پیاسی سے ان کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔

پیاسی صرف ایک مکتبۂ فکر یعنی جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے ملازمین کے مفادات سے زیادہ دلچسپی لیتی ہے۔ ان کے لئے اپنے تمام وسائل صرف کر دیتی ہے۔ عام ملازمین کے لئے اس کی جھولی میں کچھ نہ ہوتا۔

پیاسی کی اس تشدّدانہ اور متعصبانہ پالیسی کی وجہ سے ماضی میں اس کا ایک گروپ ناراض ہو گیا۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۰ء کو جب پیاسی کا الیکشن ہوا تو باغی گروپ نے قاضی شمیم اور زندہ محمود باجوہ کی قیادت میں ایک واضح شکل اختیار کر لی۔ اس گروپ کا موقف تھا کہ پیاسی اجتماعی سودے کاری کی ایجنٹ ہے۔ لہذا اسے ملازمین کے مسائل حل کرنے میں کسی تعصب یا بخل سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ تصادم، مار پیٹ اور مسلح کارروائی سے گریز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے ملازمین میں خوف و ہراس پھیلتا ہے۔ اور ان کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔"

حافظ اقبال اور مجید شیخ گروپ نے باغی گروپ کے اس مشورے کو ٹھکرا دیا اور بدستور وہ اپنی پرانی روش پر چلتے رہے جب یونین کا الیکشن ہوا تو باجوہ گروپ نے مجید گروپ کے امیدواروں کے مقابلے پر اپنے امیدوار کھڑے کر دیے۔ عام ملازمین کا جھکاؤ باجوہ گروپ کی طرف تھا اور مجید گروپ کی کامیابی غیر یقینی تھی۔ چنانچہ جماعت اسلامی، پی آئی اے انتظامیہ اور مجید گروپ نے اپنے سازشی ہتھکنڈوں سے کام لیتے ہوئے ناکامی کو کامیابی میں بدل ڈالا۔ ووٹروں کی کل تعداد دس ہزار تھی، لیکن صرف ساڑھے ۴ ہزار افراد کو ووٹ استعمال کرنے کا حق دیا گیا۔ مجید گروپ کو دھاندلی سے ۶۰ فیصد ووٹ ملے جب کہ قاضی شمیم اور باجوہ گروپ کو ۴۰ فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ یونین کے الیکشن کے نتائج سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ پی آئی اے میں مجید گروپ کی جڑیں کھوکھلی ہیں۔ جوڑ توڑ اور دہشت گردی کے سوا کوئی اور راستہ اس کے پاس باقی نہ رہا۔

پیاسی کیسے کامیاب ہوئی؟

۲۹ دسمبر ۱۹۶۹ء کے یکطرفہ ریفرنڈم میں پیاسی کی کامیابی میں جماعت اسلامی کے وسائل اور انتظامیہ کی جانبدارانہ پالیسی کا ہاتھ تھا۔ انتظامیہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھی کہ ایئرویز ایمپلائز یونین ایک مضبوط یونین ہے وہ پی آئی اے کے ملازمین کے مفادات کا سودا نہیں کرے گی۔ اور نہ انتظامیہ کے سامنے گھٹنے ٹیکے گی چنانچہ پی آئی اے سے ایئرویز ایمپلائز یونین کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا گیا۔ پیاسی کے تن مردہ میں روح پھونکی گئی اجتماعی سودے کاری کا تنازعہ کھڑا کیا گیا۔ پی آئی اے میں ہنگامہ آرائی کا محاذ گرم ہوا۔ اور پھر سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ریفرنڈم کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ یک طرفہ ریفرنڈم میں پیاسی کی کامیابی یقینی تھی۔ انتظامیہ نے اپنے تیار کئے ہوئے منصوبے کے مطابق حافظ اقبال اور مجید گروپ کو بانس پر چڑھاتی رہی۔

ریفرنڈم کے بعد مجید گروپ کو ہر مرحلے پر انتظامیہ کا تعاون حاصل رہا۔ پیاسی کے عہدیدار اگر چاہتے تو انتظامیہ کی اس موقع پرستی سے فائدہ اٹھا کر پی آئی اے کے عام ملازمین کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے، مگر پیاسی نے اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور اٹھاتی بھی کس طرح جب کہ خود اس کا وجود جماعت اسلامی اور انتظامیہ کی سازشی کوکھ سے ابھرا تھا۔ ریفرنڈم میں کامیابی کے بعد تشدد اور غنڈہ گردی کا آغاز کیا گیا۔ پی آئی اے باکسنگ کا اکھاڑہ بن گیا۔ قاتلانہ حملے، ملازمت سے علیحدگی، چارج شیٹ اور تبادلوں کے پروانے معمول بن گئے۔ پیاسی کے خلاف آواز اٹھانے کا مطلب، ملازمت سے ہاتھ دھونا یا تشدد کا نشانہ بننا تھا۔ پی آئی اے کے ملازمین نے ۲۹ دسمبر ۱۹۶۹ء میں پیاسی پر اعتماد کا جو اظہار کیا تھا اس کے لئے انہیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

> پی آئی اے کی انتظامیہ بدلتے ہوئے حالات کا گہری نظروں سے مشاہدہ کر رہی تھی، اسے یہ علم ہو چکا تھا کہ پیاسی عام ملازموں کے حقوق کے تحفظ

پیاسی کی غلط پالیسی، غنڈہ گردی اور ہنگامہ آرائی کے سبب پی آئی اے کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی۔ قومی ادارے کا وقار مجروح کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ پی آئی اے کو سیاسی اکھاڑہ بنا دیا گیا۔ یونین کے ذریعہ پی آئی اے کے وسائل پر جماعت اسلامی کا قبضہ تھا۔ جماعت اسلامی اپنی انتخابی مہم پر یونین کا فنڈ بے دریغ استعمال کرتی رہی۔ اسی دوران پیاسی کی اشتعال انگیزیوں کی وجہ سے پی آئی اے میں پے در پے کئی واقعات رونما ہوئے جن سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس قومی ادارے کی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا۔ پی آئی اے کی انتظامیہ نے اپنی چہیتی یونین کے عہدیداروں کو جو کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ اب اس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔

بہرحال انتظامیہ نے جب یہ دیکھا کہ پیاسی کی بدعنوانیوں اور عام بے ضابطگیوں سے خود اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے تو اس نے پیاسی کی کھلی سرپرستی سے دست کش ہونے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

ڈائرکٹر ایڈمنسٹریشن بریگیڈیر حمیدالدین ڈسٹین کے سخت پابند ہیں انہوں نے پیاسی کی غیر قانونی سرگرمیوں پر پابندی عاید کرنے کا فیصلہ کیا۔ پیاسی کے کارکنوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ دفتری اوقات کار میں یونین کا کام نہ کریں۔ بلکہ دیانت داری سے اپنے منصبی فرائض انجام دیں۔ پیاسی کے عہدیدار اور کارکن انتظامیہ کے کسی اعلیٰ افسر سے اس قسم کے سلوک کی توقع نہیں کرتے تھے وہ تو یہ جانتے تھے کہ انہیں "یونین کا کام کرنے"، یونین کے بل بوتے پر انتظامیہ سے مراعات حاصل کرنے، ملک بھر میں آزادانہ دورے کرنے اور یونین کے وسائل مثلاً ٹرانسپورٹ گاڑیوں کو نجی ضرورت کے لئے استعمال کرنے کی آزادی حاصل ہے اور ادارہ انہی "فرائض" کے لئے انہیں تنخواہ دیتا ہے۔ تنخواہ کے عوض دفتری کام کرنے کا مطالبہ، ان کے لئے پریشان کن بھی تھا اور اشتعال انگیز بھی بہر حال وہ مناسب موقع کی تلاش میں رہنے لگے۔

عملے کے خلاف انتظامیہ کی کارروائی

نومبر ۱۹۷۰ء میں پیاسی کے تین کارکن نائب صدر نورالعلم جوائنٹ سکریٹری نجم عثمانی اور جنرل سکریٹری لاہور ملک نذر کو نامعلوم وجوہ کے بنا پر ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یونین کے تینوں عہدیدار انتظامیہ کے ایک اعلیٰ افسر سے انتہائی بدتمیزی سے پیش آئے تھے۔ اور انہیں دھمکی دی تھی۔ یونین

> میں ناکام ہوکر ان کا اعتماد کھو چکی ہے برطرفیوں کا سلسلہ ۱۳ کے بعد ہی شروع ہوا

نے انہیں دوبارہ بحال کرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ انتظامیہ کے رویے میں یکایک تبدیلی اور یونین کے تین عہدیداروں کی برطرفی سے پیاسی جل کر تو ابن گئی تھی۔ اور انتظامیہ سے بدلہ چکانے کے لئے موقع کی تلاش میں تھی۔

ادھر پی آئی اے کی انتظامیہ بدلتے ہوئے حالات کا بڑی گہری نظروں سے مشاہدہ کر رہی تھی۔ اسے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ پیاسی عام ملازموں کے حقوق کے تحفظ میں ناکام ہوکر ان کا اعتماد کھو چکی ہے، اس لئے اب ملازموں کے خلاف ہر طرح کی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ انتظامیہ نے عام ملازمین میں خوف و ہراس پیدا کرنے کے لئے لاہور سے چار ڈرائیور اور کراچی ایم ٹی سے چار ڈرائیور برطرف کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی برطرفی، چارج شیٹ اور شوکاز کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ملازمین حیران و پریشان تھے کہ جائیں تو جائیں کہاں، پیاسی مسائل حل کرانے میں ناکام ثابت ہوئی تھی اور جانکنی کے عالم میں پڑی آخری سانس لے رہی تھی۔

۱۱ جنوری کو ٹریفک کا روسٹر جاری کیا گیا، اس نئے اوقات کار کے مطابق کسی خاص شعبے کے ملازمین کی ڈیوٹی ۱۲ گھنٹے سے گھٹا کر ۸ گھنٹے کر دی گئی تھی۔ اس نئے روسٹر کا اطلاق مشکل سے پی آئی اے کے ۶ فیصد ملازمین پر ہوتا ہے۔ پرانے اوقات کار کی رو سے ہر ملازم کو اوور ٹائم، اور بھتہ میں تقریباً ہر ماہ میں اسی نوے روپے کا فائدہ ہوتا تھا، جب کہ نئے اوقات کے اطلاق سے ٹریفک کے ملازمین کی زاید آمدنی متاثر ہو رہی تھی۔ ڈائریکٹر انتظامیہ نے نئے روسٹر کے نفاذ سے قبل پیاسی کے نمائندوں سے کہا کہ اگر اس چارٹ میں کوئی خرابی ہے تو اس پر بات چیت کی جاسکتی ہے۔"

پیاسی کے نمائندوں کو ایک سنہری موقعہ ہاتھ آیا تھا۔ وہ اسے بات چیت میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ اس وقت انہوں نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے واپس چلے آئے منصوبے کے مطابق انہوں نے نئے روسٹر کو نافذ ہونے دیا تاکہ ہڑتال کے لئے جواز پیدا ہو جائے اور اسے اپنی ساکھ بحال کرنے اور انتظامیہ کو اس کی سرکشی کا مزہ چکھانے کا موقع مل جائے۔

نئے روسٹر کے نفاد کے ساتھ ہی ۱۱ جنوری کو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مظاہرہ کیا گیا۔ ہنگامہ آرائی اور دہشت گردی سے پی آئی اے کی پوری فضا سہم گئی، ۲ بجے دن میں ایم ڈی کے دفتر کے نیچے جلسہ کیا گیا جس سے مجید شیخ، عباس باوزیر، حافظ اقبال اور شجاع الغنی نے خطاب کیا اور پی آئی اے کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا اعلان کیا، اسی جلسے میں ایک ایکشن کمیٹی تشکیل دی گئی۔

مطالبات کا علم بعد میں ہوا

۱۲ جنوری کو ۵ بجے صبح اچانک پیاسی کے کارکن دفاتر میں گھس گئے اور لوگوں کو زبردستی باہر نکالنا شروع کر دیا "آج ہڑتال ہے، کام مت کرو۔ جیسا کہ قبل ازیں کہا گیا ہے کہ یہ ہڑتال بالکل غیر متوقع تھی۔ عام ملازمین کو علم نہ تھا کہ وہ کس بات پر ہڑتال کر رہے ہیں۔ پیاسی نے ہڑتال کو طول دینے اور عام ملازمین کو ہڑتال پر اکسانے کے لئے ان کے سامنے چند گڑھے ہوئے مطالبات پیش کئے۔

نمبر ۱۔ کسی اظہار وجوہ کے بغیر برطرف شدہ ملازمین کو دوبارہ بحال کیا جائے۔

۲۔ ٹریفک کے نئے روسٹر کی منسوخی اور پرانے اوقات کار کا نفاذ۔

نمبر ۳ پیاسی سے کئے گئے مطالبات پر عمل درآمد۔

نمبر ۴ عام ملازمین اور یونین کے عہدیداروں کو دیئے گئے چارج شیٹوں کی واپسی۔

اس کے علاوہ عام ملازمین کے ذہن سے شکوک و شبہات رفع کرنے کے لئے اور انہیں ورغلانے کے لئے مزید مطالبات پیش کئے گئے۔ لیکن دوسرے دن پاکستانی عوام اور پی آئی اے کے عام ملازمین کو پریس کے ذریعہ پیاسی کے اصل مطالبات کا علم ہوا۔ جن کے لئے، کسی پیشگی نوٹس کے بغیر اس پیمانے پہ ہڑتال کی ضرورت محسوس کی گئی۔

نمبر ۱ یونین کے تین برطرف عہدیداروں کی بحالی

نمبر ۲ نئے روسٹر کی واپسی

نمبر ۳ یونین کے نمائندوں پر عائد شدہ پابندیوں کا خاتمہ

مطالبات کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اس میں عام ملازمین کی فلاح کے لئے ایسا کوئی مطالبہ شامل نہ تھا جسے منوانے

ملازموں کی برطرفی پر انتظامیہ سے پیاسی کا "اصولی" اتفاق

پی آئی اے کی حالیہ ہڑتال اور ہنگاموں میں پیاسی نے بار بار انتظامیہ پر الزام لگایا کہ یونین کے تین عہدیدار نورالعلم نذر ملک اور نجم عثمانی کو اظہار وجوہ کے بغیر برطرف کر کے ٹریڈ یونین کے مسلمہ حقوق کو پامال کیا گیا۔ چنانچہ مطالبات میں برطرف شدہ عہدیداروں کی غیر مشروط بحالی کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ اس سلسلے میں یونین کے صدر نے ۱۹ دسمبر کو مینجنگ ڈائریکٹر کو ایک خط لکھا جس میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونین اس کارروائی کو قانون یا ضابطہ کے خلاف سمجھتی ہے۔ یا اس کو یہ شبہ ہے کہ یہ کارروائی کسی معقول وجہ کے بغیر کی گئی ہے۔ خط میں صاف طور پر کہا گیا ہے

"ہم یہ نہیں کہتے کہ انتظامیہ کا فیصلہ اصولاً غلط ہے تاہم یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ ان عہدیداروں کی برطرفی سے ہماری یونین کے وقار کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ جس نے ہمیشہ انتظامیہ سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

خط موصول ہونے کے تین دن کے اندر مینجنگ ڈائریکٹر نے فیصلہ پر نظر ثانی کے لئے ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر اور دو ڈائریکٹروں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کر دیا اور جلد از جلد اس کی رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب انتظامیہ نے اس معاملے پر نظر ثانی کرنے کا یقین دلا دیا تھا تو پھر ہڑتال جیسے انتہائی اقدام کے ذریعہ اس مسئلے کو حل کرانے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی۔ کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ یونین کے وقار کو جو "سخت صدمہ" پہنچا ہے اس کے ازالے کے لئے پی آئی اے کے وقار اور ہزاروں ملازمین کے روزگار کو خطرے میں ڈال دیا گیا۔؟

"اگر تم ڈیوٹی پر گئے، تو جان سے مار دیں گے" ملازموں کو گھر پر جا کر ڈرایا گیا

کے لئے بیشتر ملازمین کے روزگار اور قومی ادارے کے وقار کو داؤں پر لگا دیا گیا تھا۔ مطالبہ نمبر ۲ کے سوا بقیہ دونوں مطالبات کا تعلق محض یونین اور اس کے عہدیداروں سے تھا۔ حافظ اقبال نے اپنی تقریر میں ٹھیک ہی کہا تھا کہ "ہڑتال یونین کی بقا کے لئے ضروری ہے"۔ ۴ جنوری کو اچانک ایک اور مطالبہ کا اضافہ ہو گیا ڈائریکٹر انتظامیہ کی برطرفی کا مطالبہ تھا۔ جبکہ منیجنگ ڈائریکٹر کے سلسلے میں مصلحت آمیز خاموشی اختیار کی گئی۔ اب یہ دیکھئے کہ اس ہڑتال کو "کامیاب" بنانے کے لئے کون سی تدبیریں اختیار کی گئیں

دہشت گردی

۱۲۔ جنوری کو ایپیا کے سینئر نائب صدر محمد عالم اور زندہ محمود باجوہ پر پیاسی اور جماعت اسلامی کے تقریباً ۴ کارکنوں نے زبردست خشت باری کی، جس کی اطلاع ایرپورٹ پولیس اسٹیشن پر کر دی گئی۔

۱۲۔ جنوری کو ایرپورٹ آنے والے تمام راستوں، ڈرگ کالونی کا لا چھپرا اور اسٹار گیٹ پر پیاسی کے مسلح کارکن آزادانہ گھوم رہے تھے، اس وقت پولیس برائے نام تھی۔ کام پر آنے والے بے شمار ملازمین کو راستوں میں گھیر لیا جاتا اور انہیں دھمکی دے کر واپس کر دیا جاتا۔ ملازمین کے تحفظ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہڑتال میں شریک نہ ہونے والے ملازمین سے ہڑتال کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا "ہمارے مطالبات شامل نہیں ہیں۔ اس ہڑتال سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے ہم اپنے کام پر واپس جانا چاہتے ہیں"۔

اسٹار گیٹ کے قریب یونین کے دفتر کے سامنے بار بار دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جلسہ کیا گیا اور ملازمین کو ورغلانے کے لئے کہا جاتا رہا کہ۔

(۱) مشرقی پاکستان کی ایر ویز ایمپلائز یونین ہمارے ساتھ ہے وہاں مکمل ہڑتال ہے جب کہ مشرقی پاکستان میں ہڑتال نہیں ہوئی

(۲) ملتان، پشاور اور لائلپور میں ہڑتال نہیں ہوئی، مگر ملازمین کو گمراہ کرنے کے لئے کہا گیا کہ ان تینوں جگہوں میں مکمل ہڑتال ہے۔ راولپنڈی میں جزوی ہڑتال ہوئی، پیاسی راولپنڈی کے صدر طارق محمود نے ۱۴ جنوری کو شام کے سات بجے جزوی ہڑتال کو غیر مشروط طور پر ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

۳۔ لاہور میں بھی جزوی ہڑتال ہوئی مگر پیاسی کے کارکن فریب سے کام لیتے ہوئے جلسے میں بار بار اعلان کرتے رہے کہ لاہور میں مکمل ہڑتال ہے۔

۱۲۔ جنوری کو شام ۵ بجے انتظامیہ نے اعلان کیا کہ ہڑتال غیر قانونی ہے۔ پی آئی اے کا اسٹاف ڈیوٹی پر آنے کے لئے تیار تھا۔ مگر رکشہ، ٹیکسیوں کی ہڑتال سے ملازمین کی بڑی تعداد دفتر میں حاضر نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ ڈرگ کالونی کا لا چھپرا اور اسٹار گیٹ پر ڈیوٹی پر آنے والے ملازمین کے ساتھ تشدد اور غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا گیا۔ اور انہیں جبراً روکا گیا۔

۱۳۔ جنوری کو بھی ملازمین کو ڈیوٹی پر حاضر ہونے سے جبراً روکا گیا۔ اسٹار گیٹ پر جلسہ کیا گیا، پیاسی کے جلسوں اور مظاہروں میں حسب معمول اسلامی جمعیت طلبا اور جماعت اسلامی کے کارکنوں کی بڑی تعداد شریک ہوتی رہی ۱۴۔ جنوری کو ساڑھے آٹھ بجے اسٹار گیٹ پر پولیس کی ایک محدود تعداد تعینات کر دی گئی۔ اس روز پیاسی کی غنڈہ گردی کے باوجود تقریباً چھ سو ملازمین ڈیوٹی پر پہنچ گئے۔

اسی روز پی آئی اے کے تین ملازمین اشرف، سلیمان اور اصغر جو لوڈر کے فرائض انجام دے رہے تھے، اغوا کر لیا گیا۔ پیپری کے قریب ان سے ان کی نقدی، گھڑیاں اور کپڑے چھین کر چھوڑ دیا گیا۔ رات کو ڈیڑھ بجے وہ ایرپورٹ پہنچے اور پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرائی پولیس نے ان کے بیان پر ملزموں کی تلاش شروع کر دی اور بالآخر انہیں گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی، وہ پیاسی کے کارکن تھے۔ ان کی تحویل سے مسروقہ مال برآمد کر لیا گیا۔ ڈرگ کالونی، لانڈھی کورنگی کے علاقوں میں رہنے والے ملازمین کے گھروں میں پہنچ کر دھمکی دی گئی کہ "اگر تم ڈیوٹی پر گئے تو جان سے مار دیں گے"۔

۱۴ جنوری کو دوبارہ اسٹار گیٹ، کالونی گیٹ اور کالا چھپرا گیٹ کی ناکہ بندی کی گئی اور ڈیوٹی پر آنے والے ملازمین کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ اس دن تقریباً دو ہزار ملازمین اپنی ڈیوٹی پر پہنچے کیونکہ پولیس کا انتظام بہتر ہو گیا تھا۔ اسی روز پیاسی کے ۱۴ کارکن مختلف الزامات میں گرفتار کر لئے گئے۔

۱۵ جنوری کو اسٹاف کی بہت بڑی تعداد ملازمتوں پر پہنچ گئی۔ ٹریفک کا اسٹاف بھی ڈیوٹی پر پہنچ گیا تھا۔ ۱۶ جنوری کو پیاسی کی جانب سے کرائی گئی ہڑتال اپنی موت آپ مر چکی تھی۔ بیشتر پروازیں اپنے وقت کے مطابق جاری تھیں۔ پی آئی اے میں تو ہڑتال نہ تھی، البتہ کراچی کے ایک مقبوضہ اخبار اور ایک جماعتی اخبار کے صفحات پر ہڑتال اور وہ بھی مکمل ہڑتال تھی جس سے پی آئی اے کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔

عام انتخابات کے بعد فسطائی تنظیم جماعت اسلامی اور اسکی ذیلی تنظیمیں بری طرح متاثر ہوئی تھیں۔ اور عوام میں ان کا وجود تقریباً ختم ہو چکا تھا مستقبل کے آئینے میں مودودی جماعت کی موت صاف طور پر جھلک رہی تھی۔ سامراج کے ایجنٹ اور رجعت پسندوں کے سرخیل دیکھ رہے تھے کہ اگر اسی طرح سے چند دن اور گذر گئے تو ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے والا بھی کوئی نہ ہو گا چنانچہ اس مرگ بے سرو سامانی سے نمٹنے کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا گیا۔ جماعت اسلامی نے ایک پرانی دلآزار کتاب کا سہارا لے کر پورے ملک میں ہنگامہ آرائی کا بازار گرم کر دیا اور عوام کے فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کر کے ایک بار پھر منفی انداز میں اپنے وجود کا احساس دلانے کی بھرپور کوشش کی۔

جماعتی تنظیموں کا پول کھل گیا

دوسری طرف پی آئی اے میں جماعت اسلامی کی بغلی تنظیم پیاسی بھی کچھ ان ہی حالات سے دوچار تھی۔ وہ عام ملازمین کے پیشہ وارانہ مفادات اور حقوق کا تحفظ کرنے کی بجائے اپنے مخالفین کو تشدد اور دنگا فساد سے دبانے کچلنے میں مصروف رہی۔ اس کے سارے وسائل جماعت اسلامی کے پروپیگنڈے پر صرف کئے گئے۔ ان کارروائیوں سے پی آئی اے کے باشعور ملازمین اور مزدور یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ پیاسی اُن کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ پیاسی کے خلاف دلوں میں نفرت بڑھتی گئی۔ لاوا اندر ہی اندر پکھلتا رہا۔ اسی دوران ایرپورٹ پر ایک ایسا اندوہناک واقعہ ہوا جس نے پی آئی اے کو ہلا کر رکھ دیا۔ پیاسی کے ایک انتہاپسند کارکن فیروز نے کیٹرنگ وین سے پولینڈ کے معزز صدر کو کچلنے کی کوشش کی تھی اس سانحے میں پولینڈ کے نائب وزیر خارجہ اور تین پاکستانی ہلاک ہو گئے۔ اس واقعہ کی چھان بین کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ پچھلے دنوں تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ صدر کو پیش کر دی۔ اور عنقریب اس کی اشاعت عمل میں آنے والی تھی۔ ہڑتال کا مقصد، اس رپورٹ کی اشاعت سے پیدا ہونے والے اثرات کو دور کرنا تھا۔

اس ہڑتال میں جماعت اسلامی کی دوسری ماتحت لیبر تنظیموں نے پیاسی کی پشت پناہی کے لئے بہت زور باندھا کیونکہ پیاسی پر جماعت اسلامی کے قبضے کے بعد ہی اسے دوسری تنظیموں پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع ملا تھا، لیکن جب کوئی یونین، خود اپنے ارکان کی حمایت سے محروم ہو جائے تو "باہر والوں" کی امداد اور صلح و صفائی کی "پیش کش" کچھ زیادہ کام نہیں آتی۔ پی آئی اے کی انتظامیہ نے دیکھ لیا کہ پیاسی خود اپنے ممبروں کی حمایت کھو چکی ہے اور اسکی جانب سے ہڑتال کا "چنگیز خانی" نعرہ اپنی موت آپ مر چکا ہے، اس لئے اس نے پیاسی کی دوسری "ہمدرد یونینوں" کی دھمکیوں کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کی، اور جماعت اسلامی کے بھیجے ہوئے "سفارشی گروگوں" کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ جو اپنی طرف سے "مصالحت" کرانے کے لئے گئے تھے۔ پیاسی کی اس ناکامی سے دوسری جماعتی "یونینوں" کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

مولانا غلام رسول مہر

امریکہ اور امن عالم

مشرق وسطیٰ کی دردناک داستان

تمام اسلامی ملک نہایت نازک مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ اگر اب بھی وہ امریکہ کے خلاف حق و انصاف کی صدا واشگاف طریقے پر بلند کرنے کیلئے تیار نہیں تو کل جو حالات پیش آنے والے ہیں، اُن کا انتظار کر لیں۔

یہ امریکہ ہے

جو عربوں کی

آزادی اور

خود مختاری

کی جڑیں

کاٹ رہا ہے

مشرق وسطیٰ کے حالات بے حد اضطراب افزا ہیں۔ اسرائیل اور امریکہ کی غلط پالیسی کے باعث اطمینان کی کوئی صورت نہیں کون کہہ سکتا ہے کہ کل کیا شکل پیش آئے گی؟ امریکہ کی روش ابتدا سے حد درجہ حوصلہ فرسا اور یاس خیز ہے۔ شدید رنج اس امر پر ہے کہ جانسن سے تو کسی بہتری اور بھلائی کی کوئی امید ہی نہ تھی۔ لیکن نکسن کے ساتھ بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس کہ نکسن کا دور عربوں کے لئے مشرق وسطیٰ کے حالات کی اضطراب افزائی کے نقطۂ نگاہ سے بدرجہا بدتر ثابت ہوا۔

ناصر مرحوم نے اس بنا پر راجرس کے امریکی منصوبے کو قبول کیا تھا کہ وہ جنگ کا خواہاں نہ تھا اور سمجھتا تھا کہ اگر گفت و شنید سے عربوں کے متصرفہ علاقے آزاد ہو سکتے ہیں تو کیوں نہ اس منصوبے کو آزما لیا جائے۔ چنانچہ تین مہینے کے لئے جنگی کارروائیاں روک دی گئیں۔ اسرائیل نے چند ہی روز کے بعد ایک بہانہ بنا کر گفت و شنید سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس اثنا میں امریکہ نے زیادہ سے زیادہ سامان جنگ، اور زیادہ سے زیادہ روپے کا انتظام اسرائیل کے لئے کر دیا۔

۱۰۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کو اسرائیل کی وزیر اعظم گولڈا میئر نے تل ابیب سے ایک بیان شائع کیا۔ جس کے آخر میں کہا:

> انجمن اقوام متحدہ میں اسرائیل کے خلاف جو بھی فیصلے ہوئے یا آئندہ ہوں، ان سے قوم کو بے پروا ہو جانا چاہیئے قوم سیاسی دباؤ کا مقابلہ بھی اس طرح کرے گی جس طرح اس نے جارحانہ اقدامات کا مقابلہ کیا۔

ظاہر ہے کہ یہ انجمن اقوام متحدہ کے فیصلوں کو بے حقیقت سمجھنے کا اعلان تھا اور ایسا اعلان اسرائیل کے کسی ذمہ دار عہدیدار کی طرف سے بے وجہ نہیں ہو سکتا تھا حقیقتاً یہ نکسن کے بھروسے پر کیا گیا تھا۔

امریکہ کی اسرائیل نوازی

۱۳ر دسمبر کو یروشلم سے یہ اطلاع شائع ہوئی کہ صدر نکسن نے گولڈا میئر کے نام گذشتہ ہفتے جو ذاتی خط لکھا تھا، اس میں یقین دلا دیا تھا کہ:

> ۱۔ اقتصادی امداد کا سلسلہ جاری رہے گا۔
>
> ۲۔ اسلحہ مسلسل پہنچتے رہیں گے۔
>
> ۳۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں جو قرارداد اسرائیل کے خلاف آئے گی۔ اس کی مخالفت کی جائے گی۔
>
> ۴۔ روس کو انتباہ کیا جائے گا کہ وہ مشرق وسطیٰ میں اپنے موجودہ کردار کو سرگرم عملی مداخلت کی شکل دینے سے احتراز کرے۔

میرے علم کی حد تک اس خط کی تردید نہیں ہوئی۔ سوچیں کہ ان حالات میں مصالحت کی کیا امید ہو سکتی ہے؟ مصری نمائندے نے بھی ایک حد تک مایوسی ہی کا اظہار کیا ہے۔

یہ بھی سوچیں کہ امریکہ اسرائیل کے خلاف آنے والی ہر قرارداد کے باب میں مخالفت کا قبل از وقت وعدہ اس وقت تک کیوں کر سکتا ہے جب تک وہ حق و انصاف سے آنکھیں بالکل بند نہ کر لے؟ نیز روس کو کوئی انتباہ کیونکر کر سکتا ہے جب تک پہلے اُسے اپنے اوپر عاید نہ کر لے؟ یعنی امریکہ کیلئے کس بنا پر مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی خاطر سب کچھ کرنا جائز ہے اور کسی دوسری طاقت کو عربوں کے لئے کچھ کرنا جائز نہیں؟ کیوں اور کس وجہ سے؟ امریکہ کو کب خدا نے کوئی خاص پروانہ عطا کیا ہے، جو دوسروں کو نہیں دیا گیا۔

اسلامی کانفرنس کی روش

۱۱ دسمبر کو واشنگٹن سے یہ اطلاع بھی شائع ہو چکی ہے کہ صدر نکسن نے کہہ دیا ہے، متصرفہ عرب علاقوں سے اسرائیل کی واپسی گفتگو سے مصالحت کا معاملہ ہوگی۔ گویا نکسن نے اسرائیل کے اصرار پر راجرس کے منصوبے میں خود ترمیم کر لی ہے۔ اس لئے کہ اسرائیل یروشلم، جولان کے پہاڑی علاقے اور جزیرہ نمائے سینا کے بعض حصے نہیں چھوڑنا چاہتا آبی شاہراہوں کا معاملہ الگ ہے۔

ہمارے ہاں کی ایک جماعت کا سربراہ یا امیر اسلامیت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھتا ہوا، مصر، سوڈان، لیبیا، الجزائر وغیرہ کے عربوں کا مذاق اڑاتا رہا کہ ان کروڑوں "سوشلسٹوں" کا ناطقہ ستائیس لاکھ یہودیوں نے بند کر رکھا ہے اُسے کب معلوم نہ تھا کہ معاملہ ستائیس لاکھ یا ایک کروڑ یہودیوں کا نہیں، امریکہ کا ہے۔ یہ اسرائیل نہیں۔ امریکہ ہے جو عربوں کی آزادی اور خود مختاری کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ پھر عرب ملکوں کا ایک جمگھٹا ہے جو اسرائیل کے خلاف تو کچھ کر نہیں سکتا، حالانکہ وہ جمگھٹا "سوشلسٹوں" کا نہیں مگر امریکہ کے متعلق بھی دو ٹوک فیصلہ کر لینے پر آمادہ نہیں۔ مذکورہ بالا جماعت بھی ایسا کوئی قدم اٹھانے کے خیال سے چھوئی موئی بنی ہوئی ہے۔ پہلے رباط (مراکش) میں ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں وہ اسلامی ملک بڑے زور و شور سے شریک ہوئے جن کے روابط امریکہ سے زیادہ گہرے تھے اور ان میں بعض بالواسطہ یا بلا واسطہ اسرائیل سے بھی وابستہ تھے۔ پھر یہ کانفرنس جدہ میں منعقد ہوئی اور اب کراچی میں بھی اس کا اجلاس ہو چکا ہے۔ کیا

نکسن نے گولڈا میئر کو اطمینان دلایا ہے کہ اسلحہ مسلسل پہنچتے رہیں گے

کوئی فرد دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ ان تین کانفرنسوں میں مختلف اہم اسلامی مسائل بروئے کار آ گئے یا مشرق وسطیٰ کے متعلق جو کچھ کہنا ضروری تھا وہ کہا گیا؟ کیا یہ حیرت کا مقام نہیں کہ کانفرنس میں کسی کو نظر نہ آیا، معاملہ اسرائیل کا نہیں امریکہ کا ہے؟ آلۂ کار کی مذمت اور کارفرما سے چشم پوشی ہمارے یا کسی کے کون سے مسئلے کے حل میں مدد بن سکتی ہے؟ اگر آپ مشرق وسطیٰ کی مصیبتوں کے سرچشمے کے بارے میں کچھ کہنے یا کرنے کے لئے تیار نہیں تو آخر کانفرنسوں پر روپیہ صرف کرنے کا فائدہ کیا ہے؟

کوئی نہیں کہتا کہ امریکہ یا کسی دوسرے ملک یا ممالک کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جائے، کوئی نہیں کہتا کہ مسلم ممالک میں اتفاق و اتحاد پیدا نہ ہو۔ تاہم اگر آپ واقعی اصلاح احوال کے آرزو مند ہیں تو وہ طریقہ اختیار کریں جو آپ کو مقصود سے قریب تر لا سکے۔ اسرائیل کچھ بھی نہیں۔ ایک بچھڑا ہے جو اندر سے خالی ہے اور اس میں سے ہوا کا گزر ہوتا ہے تو آواز نکلتی ہے۔ اس کی قوت، اس کا دماغ اور اس کا دل امریکہ ہے۔ جو کچھ کہنا ہے امریکہ سے کہیئے۔ اگر آپ نے اس کے ساتھ روابط قائم کر رکھے ہیں اور انہیں محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو کہیئے کہ عربوں کا معاملہ سہل ہے یہ طے کرا دیجئے۔ اگر عربوں کی خیر خواہی مطلوب ہے اور مقامات مقدسہ اسلامیہ یا پہلے اسلامی فیصلے کا واقعی پاس ہے تو ان عربوں کا ساتھ دیجئے جو ان مقاصد کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔ مسلم ممالک کا اتحاد و اتفاق بڑی بابرکت چیز ہے، لیکن وہی اتحاد جو خلوص و صداقت پر مبنی ہو اور عملاً ایک بے پناہ قوت بن سکے۔ وہ نہیں جس میں دل کہیں ہوں اور زبانیں کچھ کہہ رہی ہوں۔

ایک کروڑ یہودی، ستر کروڑ مسلمان

کیا یہ معلوم نہیں کہ جب مجاہدین فلسطین پر قیامت گذر رہی تھی تو امریکہ کے طیارے عربوں کے ایک ہمسائے اسلامی ملک کے اڈے پر جمع تھے اور کہا جا رہا تھا کہ شاہ حسین کو شکست ہوئی تو امریکہ مداخلت کرے گا۔ کیا ان طیاروں کا وہاں موجود ہونا فلسطینیوں کی آزادی یا عام عربوں کی حمایت کے کسی مخلص آرزو مند کے لئے اطمینان کا موجب ہوا ہو گا۔؟ یا کسی ملک کی طرف سے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات کی استواری کا انکشاف تمام مسلمانوں کے لئے اندوہ و قلق کا باعث نہیں ہوا ہو گا؟ کیا ایسی تمام سرگرمیوں کی تہ میں امریکہ کی کارفرمائی واضح نہیں؟ اگر روئے زمین کے ایک کروڑ یہودیوں کی خاطر امریکہ کو ستر کروڑ مسلمانوں کی دل آزاری میں تامل نہیں ہو سکتا تو خدارا بتائیے کہ اس امریکہ کے ساتھ تعلقات پر اصرار یا اسے نہایت خوفناک فتنے کا سرچشمہ قرار دینے سے چشم پوشی اسلامیت کا کون سا مقصد پورا کر رہی ہے؟ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کانفرنس کے کارفرماؤں کے نزدیک امریکہ کی پاک دامنی تمام اسلامی مقاصد پر فائز و برتر تھی۔

اگر آپ کے لیے امریکہ کے ساتھ روابط رکھنا باعث مسرت ہے تو اس سے کہیں کہ اسرائیل کو سابقہ حدود پر جانے کا حکم دیدے یہ انتظام ۱۹۶۷ء ہی میں ہو سکتا تھا۔ لیکن امریکہ نے اسرائیل کو تصرف پر آمادہ کیا اور خدا جانے اس عرصے میں کتنے انسان نذر اجل ہوئے مزید ہتھیار اور روپیہ دے رہا ہے تاکہ عرب برباد ہوں۔ انہیں عافیت کی کوئی ساعت نصیب نہ ہو۔ نہ آپ امریکہ کو صحیح راستہ اختیار کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ نہ آپ مظلوموں کی حمایت میں صف بندی کے لئے تیار ہیں۔ نہ ظلم و چیرہ دستی سے علیحدگی کی ہمت رکھتے ہیں آخر یہ فعل کس بنا پر اسلامی قرار پا سکتا ہے؟

امریکہ کے طیارے عربوں کے ایک ہمسائے اسلامی ملک کے اڈے پر جمع تھے اور کہا جا رہا تھا کہ شاہ حسین کو شکست ہوئی تو امریکہ مداخلت کریگا

اسرائیل خود ۱۹۶۷ء ہی میں تمام علاقے خالی کر کے ان لوگوں کے ہاتھ مضبوط کر سکتا تھا۔ جو مستقل صلح کے خواہاں تھے۔ لیکن اس سے کسی کو کیا امید خیر ہو سکتی تھی، جب کہ امریکہ اس کا پشتیبان تھا؟ آج حالات بدرجہا زیادہ نازک ہیں۔ اگر خدانخواستہ جنگ چھڑی تو کچھ نہیں کہا جا سکتا اس کا انجام کیا ہو گا۔ بربادی کے جس دائرے میں مصر، لیبیا سوڈان، شام وغیرہ ہیں، اس سے دوسرے عرب یا غیر عرب اسلامی ملکوں کی سرزمین محفوظ نہ رہیں گی۔

باقی رہا نکسن تو اس نے جو کچھ اب کہا ہے وہ غالباً آپ کی نگاہوں سے مخفی نہ ہو گا۔

۱۔ نکسن نے جنگ کی حالت میں اسرائیل کو شکست سے بچانے کی خاطر مشرق وسطیٰ میں مداخلت کے متعلق کچھ کہنے سے انکار کر دیا اور اس بارے میں قیاس آرائی کو بھی صورتحال میں اشتعال پیدا کر دینے کا موجب قرار دیا۔

۲۔ اسرائیل سے رسمی اتحاد کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس سے مشرق وسطیٰ کے امن کو فائدہ نہ پہنچے گا البتہ فوجی توازن بحال رکھنے کے لئے اسرائیل کو امداد ملتی جائے گی۔

۳۔ یہ امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس کی ذمہ داری ہے کہ مشرق وسطیٰ میں ممکنات امن کو تقویت پہنچائیں" اور میں (نکسن) اس سلسلے میں ہر ممکن سعی کروں گا۔ صلح ہو جائے تو چار بڑی طاقتیں اس کے تحفظ کی ضامن بن سکتی ہیں۔

آپ نکسن کی سیاست پر غور فرمائیں کہ ۱۹۶۷ء میں یہ نہ ہوا۔ نکسن نے صدارت سنبھال لی تو چار بڑی طاقتوں کے ذریعے سے صلح کی صورت پیدا نہ کی بلکہ اس میں رکاوٹیں پیش آئیں۔ اسرائیل سے رسمی اتحاد کو غیر ضروری قرار دیا۔ لیکن اسلحہ کی امداد جاری رکھنے کا یقین دلایا۔ آخر رسمی اتحاد کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔؟

خود ساختہ خدائی فوجدار

روس، فرانس اور برطانیہ قدم اٹھائیں اور جو کچھ وہ ضروری سمجھیں کرنا چاہیں تو امریکہ خلاف ہو گا۔ اور اسرائیل کو تقویت پہنچائی جائے گی۔ گفتگو سے صلح میں اسرائیل کی مصلحتوں کا پاس ضرور کیا جائے گا۔ یعنی جو عرب علاقہ وہ دبائے رکھنا چاہیئے اسے دبا لینے کی حمایت کی جائے گی۔ خود زیادہ سے زیادہ اسلحہ اور روپیہ اسرائیل کو دیا جائے گا۔ اور کبھی نہ کہا جائے گا کہ یہ خلاف انصاف ہے۔ البتہ روس عربوں کو اسلحہ دے تو اس کی مخالفت ضروری ہے۔ اپنے بلند پرواز جاسوس طیارے عرب علاقوں پر بھی اڑائے گا اور ویت نام پر بھی، اگر ان طیاروں کو کوئی گزند پہنچے گا، تو بمباری کر دے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ امریکہ کو خدائی فوجداری کا پروانہ کہاں سے مل گیا ہے؟ مشرق وسطیٰ میں بھی اس کا وظیفہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل جو کچھ مانگتا ہے اسے ضرور مل جانا چاہیئے، باقی کسی کے فطری ملکی ملی حقوق سے اسے کوئی تعلق نہیں خواہ وہ محفوظ رہیں یا نہ رہیں۔

پیش آنے والے حالات

افریقہ میں بھی جتنے فتنے ہیں۔ ان سب کو عام روایت کے مطابق امریکہ سے مدد مل رہی ہے۔ مثلاً جنوبی افریقہ کو پرتگال کو اور اریٹریا کے خلاف حبش کو یہ ایں ہمہ امریکہ منشور اوقیانوس کا پاس دار بھی ہے اور امن عالم کا محافظ بھی انجمن اقوام متحدہ کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے بیٹھا ہے۔ تمام اسلامی ملک نہایت نازک مقام پر پہنچ گئے ہیں اگر اب بھی وہ امریکہ کے خلاف حق و انصاف کی صدا واشگاف طریق پر بلند کرنے کے لئے تیار نہیں تو کل جو حالات پیش آنے والے ہیں ان کا انتظار کر لیں۔ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اگر وہ حالات خدانخواستہ بروئے کار آئے تو سب کو امریکہ کی حقیقی حیثیت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت پشیمانی کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گی۔

سوشلسٹ ملک بہترین دوست ثابت ہو سکتے ہیں

امریکی کمپنیوں کو ہندوستان میں بھی تیل کے وجود سے انکار تھا

ہمارے ملک میں اقتصادی اور سیاسی مسائل پر پچھلے دو سال سے خاصی دلچسپ بحثیں ہو رہی ہیں۔ انتخابات کے وقت اس میں شدت اور ترشی پیدا ہو گئی تھی۔ سیاست اور معیشت کے ہر مسئلے پر ہر شخص نے طبع آزمائی فرمائی اگرچہ ان حضرات میں سے خاصی تعداد ایسے بزرگوں کی ہے جو اقتصادیات اور موجودہ دنیا کی پیچیدگیوں کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں۔ سامراج کی عجیب عجیب تاویلیں کی گئیں اور بعض بزرگ تو بڑی دُور کی کوڑی لائے سامراج کے ساتھ سُرخ اور سفید کی اضافت استعمال فرمانے لگے۔ اسی طرح ملک کی سیاسی اور اقتصادی زندگی سے متعلق بھی خاصی دلچسپ باتیں کہی گئیں۔

ہمارے نزدیک ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک تقریباً ایک ہی قسم کے سیاسی اور اقتصادی مسائل سے دوچار ہیں اور ان سب سے نجات کا بھی ایک ہی راستہ ہے اور وُہ یہ ہے کہ ملک سے مغرب کی سرمایہ دار طاقتوں کا اقتصادی اور سیاسی اثر ختم ہو اور ملک میں سوشلسٹ نظام پیداوار قائم ہو جس کے لئے خاصی طویل جد وجہد کی ضرورت ہے۔

جن مسائل سے ہم دوچار ہیں اسی قسم کے مسائل ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان کو بھی درپیش ہیں اس سلسلے میں ہم ہندوستان کے ممتاز ماہر اقتصادیات ڈاکٹر گیان چند کا ایک مضمون شائع کر رہے ہیں، ہمارے قارئین کو اس طرح اندازہ ہو سکے گا کہ یہ مسائل کیا ہیں اور ان سے نجات کا ملتا جلتا راستہ ہمارے یہاں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے ابتدائی منصوبے

۱۹۴۷ء میں اعلان آزادی کے بعد سے ۱۹۵۱ء تک ہم اپنی منصوبہ بندی اور تعمیر و ترقی کا کام باقاعدہ شروع ہی نہیں کر سکے۔ پلاننگ کمیشن ۱۹۵۱ء میں قائم ہوا اور پہلے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں ہم اس کے سوا کچھ اور کر ہی نہیں سکے کہ جو صنعتیں اس وقت تک قائم ہو چکی تھیں، انہیں جاری رکھتے۔ لہٰذا ہمارا پہلا منصوبہ فی الاصل کوئی منصوبہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ بعض ترقیاتی کاموں کا مجموعہ تھا، جن کا آغاز پہلے ہی ہو چکا تھا اور جنہیں پورا کرنے کے ہم پابند تھے۔ بہر حال ہماری صنعتیں جاری رہیں اور آبپاشی کا نظام اگرچہ بڑی حد تک مغربی پاکستان کو منتقل ہو چکا تھا، اس کے باوجود زراعت کا کاروبار چلتا رہا چنانچہ ہم نے ترقیات کے سلسلے کا آغاز کر ہی دیا۔

ہمارے عوام کی اکثریت نادار تھی۔ ہمارے بیشتر صنعتی مزدوروں کو ناکافی اُجرت ملتی تھی اور انہیں اپنا معیار زندگی برقرار رکھنے کے لئے سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔ اس کے باوجود ۱۹۵۱ء میں جب ہم نے رسمی طور پر ترقیاتی منصوبوں کا آغاز کیا تو اس وقت تک صنعتی حالات خاصی محکم ہو چکی تھی صنعت اور زراعت کے معمولات بحال ہو چکے تھے بلکہ مواصلات کا نظام اچھی طرح کام کرنے لگا تھا۔

ہمیں اپنے راستے میں پہلی زبردست رکاوٹ ۱۹۴۹ء میں درپیش ہوئی۔ جب برطانیہ نے پونڈ کی قیمت گرا دی تھی اس وقت روپے کی قیمت بھی کم کرنی پڑی، کیونکہ ہماری بیشتر تجارت، دولت مشترکہ کے ان ملکوں سے ہوتی تھی، جنہوں نے پونڈ کی قیمت اپنے یہاں بھی گرا دی تھی۔ سکّے کی قیمت میں اس تخفیف کا ردّعمل ہماری درآمدی اور برآمدی تجارت پر مُرتّب ہونے لگا۔ بہر حال حکومت ہند کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ برطانیہ کے اس فیصلے کو چُپ چاپ قبول کر لے، اگرچہ برطانیہ نے مذکورہ فیصلہ ہم سے مشورے کے بغیر کیا تھا، حالانکہ ہم اسٹرلنگ بلاک میں شامل تھے اور ہم سے مشورہ بہر حال کرنا چاہئیے تھا۔

قصّہ مختصر ۱۹۵۱ء میں جب پہلا پنج سالہ منصوبہ نافذ ہُوا اس وقت ہمارے پیش نظر یہ مسائل تھے۔ روایتی افلاس سے نجات کی سعی، برصغیر کی تقسیم اور پسماندگی کے اثرات سے بچاؤ کی کوشش اور اپنی بڑی صنعتوں کو برطانیہ کے تسلّط سے آزاد کرانے کا مرحلہ۔

پٹ سن پر برطانوی قبضہ

ہماری پٹ سن کی صنعت زرِ مبادلہ کے حصول کا سب سے اہم وسیلہ ہے۔ اس پر برطانیہ کا قبضہ تھا، اور ہماری بیشتر جوٹ ملیں، برطانوی اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کے تصرّف میں تھیں، برطانیہ اگرچہ رُخصت ہو چکا تھا لیکن برطانیہ کا اقتصادی سامراج بدستور پنجہ گاڑے بیٹھا تھا، اس صورت میں جو کچھ ہمیں کرنا چاہئیے تھا، وُہ کرنے سے ہم معذور رہے۔ یہ نہیں کہ برطانوی سامراجیت کو ختم کر دیتے، کیونکہ اس مقصد کی تکمیل میں تو وقت درکار ہے، البتہ ہمیں چاہئیے تھا کہ برطانیہ کو صاف لفظوں میں متنبہ کر دیتے کہ اب کسی بھی اہم ترقیاتی شعبے میں ہم انہیں استحصال کرنے والا بالادست فریق بننے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہماری چائے، سوتی کپڑے اور پٹ سن کی صنعتیں بدستور انگریزوں کی عملداری میں رہیں، اسی طرح ہماری درآمدی اور برآمدی تجارت پر انگریزوں اور ان غیر ملکی بنکوں کا کنٹرول رہا جو بین الاقوامی تجارت کے لئے سرمایہ مُہیا کرتے ہیں۔

ایک اور اہم عنصر تیل کی صنعت کا تھا۔ اس وقت تک ہمارے یہاں تیل دریافت نہیں ہوا تھا۔ اب تو خیر ہماری پوزیشن بہت بہتر ہے، لیکن اُس وقت تک تیل کی تمام کمپنیاں شمالی امریکہ کی کمپنیاں تھیں، جو اپنے تیل کی ساری مقدار عرب ملکوں سے اور ایران سے درآمد کرتی تھیں۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ ہم سیاسی طور پر تو آزاد تھے، لیکن اقتصادی طور پر آزاد نہ تھے بلکہ محتاج تھے اور اس کے معنی یہ ہوئے کہ برطانیہ کا سامراج بدستور موجود تھا اور جنگِ عظیم کے بعد چونکہ برطانیہ، امریکہ کا حلیف اور طفیلی بن گیا تھا، لہٰذا برطانیہ کے توسّط سے شمالی امریکیوں نے بالواسطہ طور پر ہندوستان میں اپنا زبردست تسلّط جما رکھا تھا۔

معیشت پر امریکہ کا تسلّط

اس وقت تک، ہندوستان میں شمالی امریکہ کی سرمایہ کاری کو بہت نمایاں حیثیت حاصل نہ تھی، لیکن برطانیہ کی موجودگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی امریکیوں نے ہماری معیشت پر زبردست قبضہ جما لیا اور بعض نہایت اہم ترقیاتی شعبوں پر مسلّط ہو گئے، اب بہت سی کلیدی صنعتیں ہمارے ہاتھ میں نہیں رہیں۔ نہ نجی شعبے میں نہ پبلک شعبے میں، بلکہ وُہ سب غیر ملکیوں کے تصرّف میں چلی گئیں، ان سنگین مشکلات کی بنا پر ہماری معیشت نہایت سُست گامی سے آگے سرکتی رہی۔

آزادی کے بعد سے ہندوستان نے تین پنج سالہ منصوبوں پر کام کیا اور اب تین سال کے وقفے کے بعد اُس نے چوتھے منصوبے پر کام شروع کیا ہے۔ اس وقفے میں، منصوبہ بندی، عارضی طور پر معطل رہی۔ اس تمام عرصے میں ہماری صنعتی پیداوار دُگنی ہو گئی ہے، زرعی پیداوار میں ۸۰ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ہم نے آبپاشی کے زبردست منصوبے مکمل کر لئے ہیں، جنہیں کثیر المقاصد کہا جاتا ہے اور ان سب سے سوا، ہم نے بھاری انجینئرنگ کی صنعتیں قائم کر لی ہیں۔

نجی شعبے کی صنعتیں پہلے ہی موجود تھیں اور وُہ بدستور نہایت اہم حیثیت کی مالک ہیں اس عرصے میں چار سو کروڑ روپے جو ایک کثیر سرمایہ ہے، نجی شعبے کی صنعتوں میں لگائے جا چکے ہیں۔ اور اس سے ہم نے فولاد سازی کے تین بڑے کارخانے قائم

کئے ہیں۔

ہمارے یہاں انجینیرنگ، بجلی اور الیکٹرونک کی صنعتیں کام کر رہی ہیں۔ برقی طاقت کو ہم نے بہت ترقی دی ہے اور یہ ماننا پڑے گا کہ بنیادی صنعتوں کی اس ترقی میں سوویت رُوس کی امداد نے ایک فیصلہ کُن کردار ادا کیا ہے۔ روسیوں نے بڑی فراخدلی سے ہماری مدد کی اور اس توقع کے ساتھ مدد کی کہ اگر بڑی بڑی بھاری صنعتیں خُود ہمارے یہاں قائم ہوگئیں تو ہم آگے بڑھ کر ایک آزاد اقتصادی پالیسی از خود وضع کر لیں گے۔

اقتصادی سطح پر ہمارے ملک کا سب سے اہم واقعہ، تیل کی دریافت ہے۔ تین امریکی کمپنیاں جو ہندوستان میں کام کر رہی تھیں، برابر کہے جا رہی تھیں کہ ہندوستان میں تیل کا ذخیرہ موجود نہیں۔ تیل کا ایک چھوٹا سا کنواں آسام میں تھا، جہاں سے ہماری ضرورت کے ایک نہایت حقیر حصّے کے برابر تیل کی معمُولی مقدار برآمد ہوتی تھی، پھر ایسا ہوا کہ روس اور رومانیہ کے فنّی ماہر ہمارے یہاں آئے، انہوں نے صورتِ حالات کا جائزہ لیا اور کہا کہ ہندوستان میں تیل کی کثیر مقدار موجود ہے، اور آج کیفیت یہ ہے کہ ہماری ۵۰ فیصد ضرورت خود ہماری تیل کی پیداوار سے پوری ہو جاتی ہے۔ یہ اتنی بڑی امداد ہے کہ اس کے لئے روس کا اور رومانیہ کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے، کم ہے۔

تیل کی غیر ملکی کمپنیاں، اب تک اس کوشش میں ہیں کہ ہماری اقتصادی احتیاج اور دوسروں پر انحصار کی کیفیت بدستور باقی رہے، اسی لئے بہت سے معاملات میں وُہ ہمارے لئے مشکلات پیدا کرتی رہتی ہیں۔

سوشلزم کے راستے میں رکاوٹیں

نجی شعبے میں اگرچہ بہت ترقی ہوئی ہے، لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مُلکی معیشت میں اسکی حیثیت ثانوی ہے سابقہ رپورٹوں میں یہ کہا گیا تھا کہ نجی سرمایہ کاری کا شعبہ برقرار رہے گا او اسے معیشت کی ترقی اور سوشلزم کی تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے گا لیکن نجی شعبے کی یہ صنعتیں، نہ صرف یہ کہ عوام کا مفاد پورا کرنے میں ناکام رہی ہیں بلکہ سوشلزم کے راستے میں جس قدر رکاوٹیں ممکن تھیں، وہ سب انہوں نے پیدا کیں۔ نجی صنعتوں نے غیر ملکی مفادات سے بالخصوص امریکی مفادات سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے اور ایک منضبط اور مربُوط معیشت کے نشو و ارتقا میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں تاکہ عوام کو فائدہ نہ پہنچے۔

نجی شعبے کو اپنی ترقی کے لئے سرمایہ، بڑی حد تک پبلک کے سرمایہ سے حاصل ہوا ہے، لیکن پبلک کے مفادات کی ترجمانی نہیں ہوئی۔ محض نفع اندوزی، نجی صنعتوں کا مقصد نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ سوشلزم کی بتدریج ترقی اور سوشلسٹ معیشت کا حصول اصل مقصد ہونا چاہیئے۔ (باقی آئندہ)

۵۰ لاکھ فوجی مشیر پینٹاگن کے ملازم ہیں

امریکہ ۴۲ ملکوں کو اسلحہ فراہم کر رہا ہے

امریکہ کے حالیہ فوجی بجٹ میں غیر ضروری اضافہ ہوا ہے، اس سے امریکی عوام میں پینٹاگن کی سرگرمیوں کے متعلق شکوک وشبہات بڑھ رہے ہیں۔ بعض مبصرین کا خیال تھا کہ امریکہ ہندچین میں اپنی فوجی سرگرمیوں کو ختم کر دے گا۔ اس طرح بارہ سے لے کر بیس ہزار ملین ڈالر تک بچت ہوگی۔ یہ رقم امریکہ میں سماجی۔ معاشرتی ضرورتوں پر صرف ہوگی۔ لیکن حالیہ فوجی بجٹ سے ان امریکیوں کی اُمیدیں نقشِ برآب ثابت ہوئیں۔ امریکہ اس زائد بجٹ سے مزید اسلحہ ساز فیکٹریاں کھولے گا اور اسلحہ تیار کریگا۔

پینٹاگن دراصل اُن اجارہ دار سرمایہ داروں کا ادارہ ہے جو بیرون ملک جنگ کے امکانات پیدا کر کے امریکی عوام سے ان کی دولت لوٹ رہا ہے۔ پینٹاگن کا بنیادی مقصد دنیا میں جنگ کو پھیلانا ہے امریکہ کا یہ جنگی ادارہ انتیس ملین ایکڑ زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اس ادارہ میں تقریباً پچاس لاکھ فوجی مشیر اور اعلیٰ فوجی حکام کر رہے ہیں۔ بیشتر فوجی مشیر غیر ممالک میں تعینات ہیں جہاں وہ امریکی نواز حکومتوں کے "فوجی مشیر" کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ تقریباً تیس لاکھ افراد پینٹاگن کی اسلحہ ساز فیکٹریوں میں ملازم ہیں۔ یہ لوگ پینٹاگن کے سالانہ ۴۵۰ ملین ڈالر کے آرڈر کی تکمیل کرتے ہیں۔

امریکہ میں بہت سی اسلحہ ساز فیکٹریاں دوسری جنگ عظیم کے بعد قائم ہوئیں۔ ان کا مقصد امریکہ کو دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت بنانا تھا۔ آج یہ ادارہ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے ۱۹۷۰ء تک چھ سو ہزار ملین ڈالر کی رقم خرچ کر چکا ہے۔ ان ۲۵ برسوں کے اندر امریکہ دو جنگوں میں ملوث ہو چکا ہے۔ پہلی کوریا کی جنگ اور دوسری ہندچین کی جنگ، جو ابھی تک جاری ہے۔ اور جس سے نکلنے کے لئے امریکہ نام نہاد امن کے سارے مرحلے طے کر چکا ہے۔ اسوقت امریکہ دنیا کے تقریباً بیالیس ملکوں کو روایتی اور جدید ساخت کے ہتھیار فراہم کر رہا ہے۔ سب سے زیادہ جنگی سامان وصول کرنے والا ملک اسرائیل ہے جس نے پُرامن عرب ممالک کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع کر رکھی ہیں۔ جوہری ہتھیاروں کی تیاری اور دوسرے ملکوں میں ان کی ترسیل سے پینٹاگن نے پُرامن تبدیلی کے سارے راستے بند کر دیئے ہیں۔ اس طرح جنگ کی جنونانہ کوشش امریکہ کی خارجہ پالیسی کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔

پینٹاگن اور دوسری بڑی صنعتوں کے درمیان تعاون نے ایک نئے قسم کے "ریاستی سرمایہ داری نظام" کو جنم دیا ہے جو براہِ راست امریکہ کی داخلہ اور خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان اداروں میں تقریباً ۲،۰۰۰ ریٹائرڈ فوجی جرنیل کام کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پینٹاگن جیسے "خفیہ ادارے" میں بڑے بڑے سرمایہ دار ملازم ہیں۔ ابھی حال ہی میں امریکہ کی چار سو اہم شخصیتوں کے بارے میں انکشاف ہوا جو پینٹاگن میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ ستر افراد ایسے ہیں جو خود بڑے سرمایہ دار ہیں اور ماضی میں دفاع کے سکوٹری جوہری توانائی کمیشن کے چیئرمین سی آئی اے کے ڈائریکٹر وغیرہ رہ چکے ہیں۔ پینٹاگن ملک کے سائنس دانوں کی خدمت مستعار لے سکتا ہے۔ اس وقت بھی اس ادارے میں ہزاروں سائنس دان ملک کی "دفاعی" سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ پینٹاگن کا موقف یہ ہے کہ جو ملک جتنا جوہری ہتھیار تیار کریگا۔ وہی ملک دنیا سے تیسری جنگ کے خطرات کو ختم کر سکتا ہے۔

ایک طرف پینٹاگن ہتھیاروں کی تیاری والسلحہ ساز فیکٹریوں کے قیام میں کروڑوں ڈالر خرچ کر رہا ہے تو دوسری طرف امریکی عوام ہندچین میں جنگ کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں اور ایک پُرامن معاشرے کے خواہش مند ہیں۔ لیکن امریکی عوام سرمایہ داروں کے اس تضاد اور مفاد کو کہاں سمجھ سکتے ہیں! عوامی مظاہروں کو روکنے کیلئے پینٹاگن تین طریقوں پر عمل کرتا ہے۔

۱۔ پولس فورس کے ذریعہ مسلسل خوف وہراس پیدا کیا جاتا ہے۔

۲۔ مقبول سیاسی رہنماؤں اور جمہوری اداروں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لئے ایک خفیہ ادارہ کام کر رہا ہے۔

۳۔ امریکی عوام کی توجہ مسائل سے ہٹانے کے لئے کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈے کا سہارا لیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ پینٹاگن اور بہت سے طریقوں سے امریکی عوام کو اپنی قید میں رکھتا ہے تاکہ امریکہ کی جنگجویانہ پالیسیوں کے خلاف مظاہرے عوامی تحریک کی شکل نہ اختیار کر سکیں۔

لیکن اس کے باوجود امریکہ میں ایسے دانشور اور صحافی موجود ہیں جو جرأت رندانہ سے کام لے کر پینٹاگن کی جنگی پالیسیوں کو بے نقاب کر رہے ہیں۔ اور ان خطرات وخدشات کی نشاندہی کر رہی ہیں جو امریکی عوام کو ان پالیسیوں کی وجہ سے درپیش ہو سکتے ہیں۔ شاید ان محبِ وطن امریکیوں کی ہی کوشش سے امریکہ کا معاشرہ جنگی ذہنیت سے پاک ہو جائے۔

انور احسن صدیقی

دو تاریخیں — دو نظمیں —

سب جیت گئے

الیکشن — ۶۴ء

موت کا جشن مناؤ، کہ وہ سب جیت گئے
شاہراہوں پہ نکالو کوئی لاشوں کا جلوس!
بستیاں پھونک دو اور روشنیاں گل کر دو
دور تک خون کے چھینٹوں سے چراغاں کر دو
بے گناہوں کے تراشیدہ سروں سے یارو
پھر شہنشاہ کی اب تخت نشینی ہو گی!
کاٹ لو ہر وہ زباں جس پہ گِلہ باقی ہے!
تھام لو رات کا دامن، کہ سحر قاتل ہے
بک گیا رائے دہندوں کا سرِ راہ ضمیر،
چند سکوں کے لئے، بھیک کے ٹکڑوں کے لئے
آج ہر سمت ہے ایماں کی تجارت کو فروغ

نوحۂ مرگ سناؤ، کہ وہ سب جیت گئے
شہر میں آگ لگاؤ، کہ وہ سب جیت گئے
زہر کا جام اٹھاؤ، کہ وہ سب جیت گئے
آگ کے پھول کھلاؤ، کہ وہ سب جیت گئے
ایک مینار بناؤ، کہ وہ سب جیت گئے
دوستو، سر کو جھکاؤ، کہ وہ سب جیت گئے
قصۂ غم نہ سناؤ، کہ وہ سب جیت گئے
صبح سے لو نہ لگاؤ، کہ وہ سب جیت گئے
تم بھی مول اپنا چکاؤ، کہ وہ سب جیت گئے
قتلِ جمہور کراؤ، کہ وہ سب جیت گئے
اک دکاں تم بھی لگاؤ، کہ وہ سب جیت گئے

اور اگر تم سے یہ سب ہو نہ سکے اے یارو
تہ زنداں چلے آؤ، کہ وہ سب جیت گئے

(جنوری ۱۹۶۵ء)

نوشتۂ دیوار

الیکشن — ۷۰ء

ترس رہے تھے جو برسوں سے روشنی کے لئے
ملا نجات کا لمحہ تو ایک لمحے میں
ٹھکانے لگ گیا میزانِ وقت پر تل کر
ہیں آج خاک نشینوں کی ٹھوکروں میں وہ سر
بنا رہے تھے جو اہلِ وطن کے قبرستان
جو گدّیوں سے زباں کھینچنے کو کہتے تھے
بساطِ وقت پہ آئے تو طفلِ مکتب تھے
دکانِ فتویٰ فروشی بڑھا کے جاتے ہیں
اڑا کے لے گئی باطل تصوّرات کی راکھ
ہوا ہے چاک مقدس جہالتوں کا فریب
نقیبِ شہر کے گھر میں ہے آج سنّاٹا

وہ جن کے شانوں پہ پیرانِ تسمہ پا تھے سوار
عبور کر گئے کتنے ہی ظلمتوں کے حصار
بہت سا خار و خس و خاک و گند گرد و غبار
تنے ہوئے تھے جو کل تک لبصد غرور و وقار
سجائے بیٹھے ہیں خود اپنی حسرتوں کے مزار
وہ اہل دل کی عدالت میں کھینچ گئے سردار
وہ بھانت بھانت کے عیّار و شاطر و ہشیار
سنبھالتے ہوئے دامان و جبّہ و دستار
نسیمِ آگہی و فکرِ تازہ کی یلغار
نظر نواز ہے جھوٹی فضیلتوں کا فرار
امارتوں کا بھرم کھل گیا سرِ بازار

نہ روتے خون کے آنسو تو کیا کرے آخر
وہ آنکھ، پڑھ نہ سکی جو نوشتۂ دیوار

(جنوری ۱۹۷۱ء)

ساقی جاوید

تشنہ لبانِ دشتِ غم

تشنہ لبانِ دشتِ غم
جوئے لبن نہیں یہاں
کنجِ تخیل دور ہے
شہرِ سبا نہیں ہے یہ
اُس کی فصیل دور ہے
بڑھتے رہو کہ دیر تک
غم سے رہے گا واسطہ
آساں نہیں ہے دوستو
عشق و وفا کا راستہ
بڑھتے رہو کہ راہ میں
دار و رسن بھی آئیں گے
لاش و کفن بھی آئیں گے
دستِ ستم کے سائے میں
چلتے رہو کہ دوستو!
دستِ ستم کے سائے میں
چلنا نصیبِ عشق ہے
خونیں تمام پیرہن،
سارا بدن لہو سہی
لیکن سفر عزیز ہے
اہلِ سفر کو دوستو!
صرفِ وفا کریں گے ہم
خونِ جگر کو دوستو!
خونِ جگر پکار کر
جب تک کہے نہ شوق سے
منزل قریب آ گئی
منزل قریب آ گئی
سُرخی اُفق پہ چھا گئی

پی پی ایل کی بھوک ہڑتال ختم ہو گئی۔ ہڑتالی کارکن قید سے رہا ہو گئے، برطرف ہونے والوں کی ایک تعداد ادارے میں واپس چلی گئی شہر، جسے ابتدائی اطلاعات کے مطابق "فوج کے حوالے" کر دیا گیا تھا۔ اب امن کی فصیل میں واپس آ گیا ہے۔ پیپلز پارٹی کے سربراہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی اس یقین دہانی پر کہ مستقبل کی حکومت صحافیوں سے کئے ہوئے ایک ایک وعدے پورے کرے گی، پی پی ایل کے کارکنوں نے اپنی جدوجہد کو حالیہ مرحلے پر روک دیا ہے "تاکہ اقتدار کی منتقلی پُرامن طور پر ہو جائے" لیکن جدوجہد ختم نہیں ہوئی۔ اقتدار کی پُرامن منتقلی کے بعد، اگر

- تحریر و تقریر پر سے پابندیاں ختم نہ کی گئیں
- کالے قانون منسوخ نہ ہوئے
- نیشنل پریس ٹرسٹ کو نہ توڑا گیا
- اور تمام صحافیوں اور اخباری کارکنوں کو جنہیں اپریل ۱۹۷۰ء کے بعد سے اب تک ملازمتوں سے برطرف کیا گیا، بحال نہ کیا گیا تو

جدوجہد کا دوسرا مرحلہ شدید تر ہو گا۔ اور یقین دہانیوں کے چھینٹے پھر اس آگ کو سرد نہ کر سکیں گے۔

اخبارات نیشنل پریس ٹرسٹ کی تنسیخ کے بغیر آزاد نہیں ہو سکتے

عوام، صحافت کو سرمایہ داروں کے غلبے سے آزاد کرائیں گے

پی پی ایل کے کارکنوں کی جدوجہد جاری رہے گی

امین مغل

پی پی ایل کا جھگڑا کیا ہے اس کی نوعیت اور محرکات کا ذکر صفدر میر کے اُس کھلے خط میں ملتا ہے جو انہوں نے صدر یحییٰ اور عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے لیڈروں کو بھیجا تھا۔ محمد صفدر میر کسی زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔ اپنے ترقی پسند ماضی کے باعث ایوب آمریت اور کالاباغ دہشت گردی کے دور میں زیرِ عتاب آئے اور نوکری بچی نہ کر سکے۔ تبادلوں کے چکر میں ڈالے گئے، لیکن انہوں نے پاؤں کے چکر کو زنجیر نہ بننے دیا اور بالآخر پاکستان ٹائمز میں پہنچ گئے۔ محمد صفدر میر سے "زینو" بنے اور ثقافتی نوٹس لکھنے لگے۔

جب اپریل کی ملک گیر ہڑتال ختم ہوئی تو پاکستان ٹائمز اور امروز کے بارہ سینئر ارکان کو نوکریوں سے جواب دے دیا گیا۔ ان میں وفاقی انجمن پاکستان کے سیکریٹری جنرل منہاج برنا، انجمن صحافیان پنجاب کے صدر حمید اختر، اے ٹی چوہدری، عباس اطہر اور عبداللہ ملک اور آئی اے رحمان جیسے اصحاب شامل تھے، جن کی زندگیاں پی پی ایل کی تعمیر میں گذر چکی تھیں۔ اور جو صحافتی ٹریڈ یونین تحریک کے روحِ رواں تھے۔ اب صفدر میر کے نام پی پی ایل ورکرز یونین کی صدارت کا قرعہ پڑا۔ صفدر میر نے اپنے اس خط میں "انصاف میں تاخیر" اور "اقتدار کی نخوت" کی شکایت کی ہے۔ اور انہیں بھوک ہڑتال کا محرک قرار دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ سولھویں صدی کے شیکسپیئر کے کرداروں نے بھی یہی شکایت کی تھی! کیا سولھویں صدی سے ابھی ہم بیسویں صدی میں نہیں پہنچے!

صفدر میر کے اُس کھلے خط سے موجودہ کش مکش کے محرکات کا سُراغ ملتا ہے۔ اپنے خط میں انھوں نے کہا ہے کہ اگر معاملہ معمولی نوعیت کا ہوتا تو میں آپ کو (صدر یحییٰ، شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو) زحمت نہ دیتا اور پی پی ایل (پاکستان ٹائمز اور امروز کے ناشرین) کے اندر ہونے والے واقعات کی طرف توجہ نہ دلاتا۔ صرف دسمبر ۱۹۷۰ء کے مہینے میں ایسے کارکنوں کی تعداد پندرہ تک پہنچ گئی ہے جن کو بغیر کسی رسمی کارروائی کے برطرف کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح جنوری میں مزید گیارہ ارکان کے برطرف ہونے کا اندیشہ ہے۔

صفدر میر نے کہا ہے کہ ملازمت سے برطرف ہونیوالوں میں بہت سے ایسے ہیں جو اس ادارے میں پندرہ سے بیس برس تک کام کر چکے ہیں۔ ان میں صحافی، پریس کارکن، چپراسی، چوکیدار اور کلرک ہیں۔ یہ لوگ ادارے کے سب شعبوں سے متعلق ہیں۔ اور ان کی بے سبب برطرفی سارے ادارے میں بددلی کا باعث بن رہی ہے۔

محنت کش طبقوں کے خلاف سازش

صفدر میر نے کہا ہے کہ پی پی ایل کے کارکنوں کو روزگار سے محروم کرنے کا منصوبہ اس سازش کا حصہ ہے جو اس ملک کے محنت کش طبقوں کے خلاف ہر جگہ کی جا رہی ہے۔ یہ مسئلہ صرف اس ادارے کے چند کارکنوں یا دوسرے اخباری اداروں کے متعدد کارکنوں کا نہیں کہ جن کے کیس پریس کے ذریعہ منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ پورے ملک کے بے شمار صنعتی اداروں میں حقوق کے حساب سے تخفیف میں آنے والے مزدوروں کے مسئلہ کا حصہ ہے۔

صفدر میر نے کہا کہ مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ محنت کش طبقہ نے اپنے حقوق کے مانگنے اور اپنے حقوق کا استعمال کرنے کا جو ناقابلِ معافی گناہ کیا ہے، اُس کی سزا اُس کو اس طرح دی جا رہی ہے کہ اُن سے سیاسی طور پر انتقام لیا جا رہا ہے اور اُنہیں ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔

صفدر میر نے کہا کہ اخباری صنعت میں سارا جھگڑا اپریل ۱۹۷۰ء کی ملک گیر ہڑتال سے شروع ہوا۔ اخباری کارکنوں کے مطابق یہ ہڑتال ہر لحاظ سے جائز تھی۔ معاملہ چونکہ عدالت میں ہے اس لئے اس کے حسن و قبح پر بحث نہیں ہو سکتی لیکن



ایک یادگار تصویر۔ گذشتہ ہڑتال کے خاتمے پر لاہور میں کارکن صحافیوں اور جمہوریت پسند کارکنوں کا ایک جلوس۔ مالکانِ اخبارات کی انتقامی کارروائیوں کی مذمّت کیلئے نکالا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہڑتال کے بعد بہت سے اخباروں کی انتظامیہ نے تقریباً ۲۵۰ صحافیوں اور دوسرے اخباری کارکنوں کو رزق سے محروم کر دیا۔ پی پی ایل کے ۱۲ سینیئر ارکان عملہ کو ملازمتوں سے برطرف کیا گیا۔ اِن میں سے اکثریت نے اپنی عملی زندگی کا آدھے سے زیادہ حصّہ اس ادارے میں گذارا تھا۔

پی پی ایل کے جنرل مینجر شیخ آفتاب احمد ہیں اور اس کے موجودہ چیئرمین ایس اے رحمان۔ صفدر میر نے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اپریل ۱۹۷۰ء سے ہی پی پی ایل کی انتظامیہ ان دو اصحاب کے باعث نہ صرف پی پی ایل ورکرز یونین کے عہدیداروں کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنا رہی ہے بلکہ عام کارکنوں کو بھی ہراساں کر رہی ہے۔ یونین کے کئی عہدیداروں کا پی پی ایل کے علاقہ میں داخلہ بند ہے محض اس لئے کہ وہ اب ادارے کے رُکن نہیں رہے۔ صفدر میر کے کہنے کے مطابق، یہ طرزِ عمل ہر لحاظ سے غیر قانونی ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یونین ایگزیکٹو کمیٹی اور جنرل باڈی کی میٹنگوں کو ناکام بنانے کی کوششیں کی جاتی ہیں یہ کہہ کر کہ اجلاس ادارے کے اندر نہیں ہوسکتے۔ انہوں نے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ اس سلسلے میں پولیس سے بھی مدد لی جاتی ہے اور جب پولیس سے پوچھا جائے تو وہ کہتی ہے کہ وہ مارشل لاء احکام کے تحت ایسا کر رہی ہے۔

صفدر میر نے کہا ہے کہ انتظامیہ زیڈ اے سلہری اور ایڈیٹر امروز ہارون سعد کے ذریعہ یونین کے سرگرم کارکنوں کو ڈراتی دھمکاتی ہے۔ زیڈ اے سلہری کے بارے میں صفدر میر کا کہنا ہے کہ اُن کو سابق وزیر نوابزادہ شیر علی کی ہدایت پر پاکستان ٹائمز کا سینیئر ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا تاکہ وہ پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کے خلاف پروپیگنڈا کریں۔

یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟

صفدر میر کا کہنا ہے کہ اِن سرگرمیوں کا مقصد پی پی ایل کی انتظامیہ کی نااہلی کو چھُپانا ہے۔ پی پی ایل کے ساٹھ لاکھ روپے کے واجبات دوسرے کاروباری اداروں کے ذمّے ہیں، ان میں سترہ لاکھ روزنامہ مشرق کے ذمّہ ہیں۔ یہ واجبات پی پی ایل انتظامیہ ابھی تک وصول نہیں کر سکی۔ اور اگر یہ واجبات وصول ہو جائیں تو ادارہ پی پی ایل کاروباری اعتبار سے مستحکم اور منفعت بخش بن جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس آفتاب احمد۔ ایس اے رحمٰن انتظامیہ نے پی پی ایل کو تیرہ لاکھ کا مقروض قرار دیا ہے۔ بجائے اس کے کہ واجبات وصول کر کے ادارے کو منفعت بخش قرار دیا جائے، آفتاب احمد۔ ایس اے رحمٰن انتظامیہ اسٹاف کو برطرف کر کے روپیہ بچانا چاہتی ہے لیکن کس اسٹاف کو برطرف کر کے؟ غریب کم تنخواہ پانے والے کلرکوں، چپراسیوں اور سب ایڈیٹروں کو!

اشرفیاں لُٹیں، کوئلوں پر مہر

ایک طرف بچت کا کلہاڑا غریبوں پر چل رہا ہے تو دوسری طرف پاکستان ٹائمز کے لئے ایک نیا "سینیئر" ایڈیٹر

> سلہری کو نوابزادہ شیر علی کی
> ہدایت پر ۸۰ ہزار روپے
> سالانہ کے عوض، عوام دشمن
> پروپیگنڈے کے لئے سینیئر
> ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا

(زیڈ اے سلہری) لایا جاتا ہے جس کو سال کی اسّی ہزار روپیہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ حالانکہ اُس کے بغیر بھی پاکستان ٹائمز کامیابی سے چلتا رہا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پی پی ایل ورکرز یونین کو تباہ کر دیا جائے: آفتاب احمد کوشش کر رہے ہیں کہ پی پی ایل ورکرز یونین تباہ ہو جائے۔ اس کے لئے وہ کارکنوں کو بُلا بُلا کر ڈراتے دھمکاتے اور پاکٹ یونین کے رُکن بننے کے لئے کہتے ہیں۔ اس پاکٹ یونین کے بعض ارکان ترغیب کے لئے اسلحہ بھی استعمال کرتے ہیں۔

پچھلے دو سال کی سیاسی جدوجہد سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پی پی ایل کے کارکنوں کی برطرفی اور اُن پر سختی انجمن سازی، فکر و ضمیر اور صحافت کی آزادیوں کے خلاف مہم کا حصّہ ہے۔ اس سارے ڈرامے کے خالق اور اس ڈرامے کا خرچہ برداشت کرنے والے

بھی لے اجارہ دار سرمایہ داروں کے بائیس خاندان ہیں، جو ہمارے اخباروں کے سب سے بڑے سلسلے کے مالک ہیں۔ یہ سلسلہ پریس ٹرسٹ کے نام سے غلط طور پر موسوم ہے۔ پی پی ایل انتظامیہ کی حرکتوں کے اصل ذمہ دار یہ لوگ ہیں۔ صحافت پر انہوں نے حملہ یہ کہہ کر کیا کہ وہ سوشلزم کو ختم کرنا چاہتے ہیں جس کسی صحافی میں ذرہ بھر بھی "جمہوری ضمیر" تھا یا جو اُن لوگوں کی تطہیر کے خلاف تھا جن پر سوشلسٹ ہونے کا لیبل لگا دیا گیا تھا، وہ صحافی ان بائیس خاندانوں اور اُن کی حامی سیاسی جماعتوں کے غصے کا نشانہ بن گیا۔

اِنتخابات کے نتائج نے ان عناصر کو حواس باختہ کر دیا ہے۔ محنت کش طبقہ اب خواب سے بیدار ہو چکا ہے۔ اور اُن کیلئے خطرہ بن گیا ہے۔ سرمایہ داروں کی خواہش ہے کہ اِس طبقہ کو تہس نہس کر دیا جائے۔ صفدر میر نے کہا: "ہم اِس حملہ کا پہلا شکار ہیں"۔

پی پی ایل ورکرز کا مسئلہ اور انصاف میں تاخیر

صفدر میر نے کہا ہے کہ ہماری یونین قانونی مقدّمے میں جُتی ہوئی ہے جو بڑے عرصے سے چل رہا ہے۔ یہ مقدّمہ پی پی ایل اسٹاف کے ۱۲ سینئر ارکان کی طرف سے ہے جن کو مئی ۱۹۷۰ء میں ہڑتال کے بعد برطرف کیا گیا تھا۔ ہم لوگوں کے پاس نہ تو وسائل ہی ہیں اور نہ اتنا صبر ہے کہ نت نئی برطرفیوں کو برداشت کر سکیں۔ "انصاف میں تاخیر" ایسی بات ہے جسے صرف غریب لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے برطرف شدہ ارکان اور اُن کے خاندان بھوکے مر رہے ہیں، وہ قانونی عمل کے پورا ہونے کا اِنتظار نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہم جو ابھی تک مُلازمت پر ہیں ان کو بھوکا مرتے دیکھ سکتے ہیں۔

صفدر میر نے عبدالرشید (چوکیدار) اور محمّد خان (چپراسی) کے ساتھ مل کر یہ لکھا ہے کہ ہم تینوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم پی پی ایل کے دفاتر کے سامنے ۶ جنوری ۱۹۷۱ء سے غیر معینہ مدّت کے لئے "بھوک ہڑتال کرینگے۔" ہماری خواہش صرف اتنی ہے کہ پی پی ایل انتظامیہ اس انتقامی کارروائی کو بند کرے اور اُن برطرفیوں سے باز آئے۔ جن کا اُس نے منصوبہ بنایا ہے اور جن کو ماضیٔ قریب میں برطرف کیا گیا ہے اُنہیں ملازمت پر بحال کرے۔" ہمیں پتہ نہیں کہ ہمارے اس عمل سے دُنیا کے آفتاب احمدوں، ایس اے رحمنوں اور اے کے سوماروں پر اثر ہوگا یا نہیں۔ لیکن بہر حال، کوشش کر دیکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔"

کھُلے خط کے آخر میں صفدر میر نے کہا: "ہمیں پتہ نہیں کہ ہمارے اس فعل سے لوگوں یا لوگوں کے لیڈروں کا ضمیر جاگے گا یا نہیں۔ ہم صرف یہ محسوس کرتے ہیں کہ اِن حالات میں اُن کارکنوں کے لئے جن پر رزق کے دروازے بند ہو جائیں۔ اُن کے ہمدردوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ اپنے آپ کو بھوکا ماریں اور

پی پی ایل کے کارکنوں کی برطرفی آزادیٔ صحافی

ایسی زندگی سے در گزریں جو پہلے ہی اُن کے لئے ناقابلِ برداشت بن چکی ہے کچھ تو "انصاف میں تاخیر" کے باعث اور کچھ "اقتدار کی نخوت" کے باعث۔ اس طور ہم اپنے اُن اَن گِنت ساتھیوں کو راستہ دکھا سکیں گے جو ہماری طرح اس کش مکش سے دوچار ہیں جو روزگار سے محروم ہو چکے ہیں اور جو چوری چکاری اور مسلّح بغاوت ایسا غیر مہذب راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔

کارکنوں کے سات مطالبے

پی پی ایل ورکرز یونین کے مطالبے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ پی پی ایل میں انتظامی اور مالی دھاندلیوں کے خلاف تحقیقات کے لئے ایک ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا جائے۔ جو تحقیقات مکمل ہونے تک ادارے کو چلائے اور انہی سفارشات پر عمل کرائے۔

۲۔ پی پی ایل کے منیجر اور ایکٹنگ مینجنگ ڈائرکٹر شیخ آفتاب احمد کو فوراً علیحدہ کیا جائے۔

۳۔ یکم مئی ۱۹۷۰ء کے بعد جن ملازموں کو پی پی ایل سے نکالا گیا ہے یا استعفیٰ دینے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ان کی ملازمت بحال کی جائے اور تمام واجبات مع عبوری امداد ادا کئے جائیں

۴۔ پی پی ایل ورکرز یونین کے مطالبات کی حمایت میں گرفتار کئے جانے والے تمام بھوک ہڑتال کرنے والوں کو فوراً رہا کیا جائے۔

۵۔ ملازمین کی برطرفیاں، انتقامی کارروائیاں، اور ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ ختم کیا جائے۔

۶۔ پی پی ایل ورکرز یونین کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔

۷۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑ کر ادارے کے اخبارات پی پی ایل ورکرز یونین کے حوالے کر دیئے جائیں۔

پی پی ایل کے ذکر کے ساتھ نیشنل پریس ٹرسٹ کا ذکر ناگزیر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے قیام کا سب سے زیادہ نقصان پروگریسو پیپرز لمیٹیڈ کو ہوا ہے۔ میاں محمد افتخار الدین کی زیرِ سرکردگی قائم ہونے والے ادارے کے ڈائرکٹروں میں سید امیر حسین شاہ اور مظہر علی خاں ایسے ترقی پسند اصحاب شامل تھے۔ ۱۹۵۹ء میں مارشل لاء کا پہلا حملہ اس ادارے پر ہوا۔ اسے سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ لیل و نہار، پاکستان ٹائمز، اور امروز کے ایڈیٹر مستعفی ہو گئے۔ لیکن ان اداروں کے مخلص کارکن تمام نامساعد حالات کے باوجود سچ کی بات کہتے ہی رہے جس کے

باعث یہ ادارہ دائیں بازو والوں کو کھٹکتا رہا۔

مارچ سنہ ۶۴ء میں مرکزی وزیر صنعت نے نیشنل پریس
ٹرسٹ کے قیام کا اعلان کیا۔ پریس ٹرسٹ کے آباد کاروں کی
اس وقت چوبیس تھی، بعد میں کبھی ۳۵ اور کبھی ۳۹ بتائی گ
ان میں داؤد کارپوریشن، داؤد کاٹن مل، کرنافلی پیپر بورے والا ٹیکس
مل، داؤد انڈسٹریز، بھوانی وولن ٹیکسٹائل ملز، فنینسی انویسٹم
نیشنل کمرشل بنک، ولی بھائی قمرالدین سندھ، گندھارا انڈس
مینجمنٹ، قاسم دادا، جسٹی سنز سٹیل ملز، محمد امین محمد بشیر، بر ماش
ستار ٹیکسٹائل مل، سٹینڈرڈ بنک، طاؤس جی فاؤنڈیشن، حبیب
(حمید ڈی حبیب) حبیب بنک (رشید ڈی حبیب) حسینف
سہگل (کوہ نور انڈسٹریز، کوہ نور ریان ملز، کوہ نور لمیٹڈ



سہگل، خالد سہگل)، آدم جی لمیٹڈ، علی آٹوموبائل، بٹالہ انجنیئرنگ
شاہنواز، ایم کے لمیٹڈ، امین جوٹ ملز، کالونی ٹیکسٹائل (میاں نص
اے۔ کے سومار، آدم جی سنز، نیشنل بنک وغیرہ (بحوالہ آزاد) روپ
اسی طور اکٹھا کیا گیا جیسے کنونشن لیگ کے لئے صنعتکاروں سے چند
وصول کیا جاتا تھا۔ تمام ابتدائی آباد کاروں نے پچاس لاکھ روپیہ جم
کیا۔ اس کا انتظام بورڈ آف ٹرسٹیز کے سپرد کیا گیا جس کے
ارکان رکھے گئے۔ ان میں ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن، ڈائرکٹر اسل
ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، مینجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان
صدر انجمن ترقی اردو، پشاور، ڈھاکہ اور راجشاہی کے وائس چانس
اور دو نمائندے آباد کاروں میں شامل تھے۔ یہ سب حضرات حکومت
کے اپنے آدمی تھے۔ اس لئے پالیسی حکومت کے ہاتھ میں رہی۔

ٹرسٹ نے مارننگ نیوز کے بعد پروگریسو پیپرز (پاکستان
ٹائمز، امروز، سپورٹ ٹائمز) پر ہاتھ صاف کیا۔ اس کمپنی کو خریدنے
کے لئے ٹرسٹ کے پاس سرمایہ نہیں تھا۔ چنانچہ پہلے ٹرسٹ نے
اس ادارے کے اکثریتی حصص بغیر رقم ادا کئے ہوئے اپنے نام
منتقل کرائے۔ اور پھر اس ادارے کو نیشنل بنک کے پاس گروی رکھ

خلاف مہم کا ایک حصہ ہے

کے ۴۰ لاکھ روپے کے لگ بھگ رقم قرض لے کر ان حصص کی قیمت ادا کی اور سود کی ادائیگی کا ذمہ دار بھی اس ادارے کو ٹھہرایا۔" یہ قدم غیر آئینی تھا، چنانچہ بعد میں پی پی ایل کے بعض حصہ داروں نے نیشنل بنک سے قرضہ لے کر حصص کی قیمت ادا کی اور پی پی ایل کی املاک کو واگذار کرایا۔ ان کے بعد انجام اور مشرق کو بھی خرید لیا گیا۔ لیکن لاکھوں کی آمدنی والے ادارے کے لئے صرف ستر ہزار روپے دیئے گئے۔ پھر دینک پاکستان۔ وغیرہ وغیرہ پریس ٹرسٹ سرکاری ادارہ کی طرح کام کرتا رہا۔ اچھے صحافی اخباروں کو چھوڑ کر جاتے رہے۔ مالی طور پر ادارے کمزور ہوتے رہے۔ پروگریسو پیپرز کو جب حکومت نے اپنی تحویل میں لیا تو اس وقت اس کا بنک میں چالیس لاکھ روپیہ موجود تھا۔



لیکن آج اس ادارے کی مشینیں خستہ ہو چکی ہیں۔ اکثر کاغذ خریدنے کے لئے روپیہ نہیں ہوتا۔ کمپنی بہت سے اداروں کی مقروض ہو گئی ہے اس طرح کے بے شمار نقصانات ہیں جو نیشنل پریس ٹرسٹ کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

پریس ٹرسٹ کو توڑنا کیوں ضروری ہے؟

نیشنل پریس ٹرسٹ اس لئے توڑنا ضروری ہے، کہ اجارہ داری سے اخبارات کی آزادی مجروح ہوتی ہے۔ اس وقت وہ سرمایہ داروں کی جاگیر بنا ہوا ہے اور جیسا کہ صفدر میر نے اپنے خط میں لکھا ہے۔ یہ بائیس خاندانوں کے مفادات کی نگہداشت کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ پروگریسو پیپرز کے حالات کی بہتری نیشنل پریس ٹرسٹ کے خاتمہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر آج فرض کر لیجئے! پی پی ایل کے بیشتر مطالبات تسلیم کر لئے جاتے ہیں لیکن ٹرسٹ قائم رہتا ہے۔ تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ عنانِ اقتدار پریس ٹرسٹ کے ہاتھوں میں ہے۔

ہمیں اس امر سے تشویش ہے کہ پی پی ایل کے مسئلہ کو بعض

سیاستدان پنجاب کے آئندہ سیاسی خاکے میں اپنی جگہ پیدا کرنے کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سیاسی طالع آزما ایک سے ایک بڑھ کر بولی بول رہا ہے اور سوچ رہا ہے کہ اس طرح آنے والی وزارت میں اپنا مقام پکا کرے۔ سیاسی اقتدار کی خواہش کوئی بری بات نہیں، بلکہ ایک حد تک اس کا ہونا سیاسی صحت اور معاشرے کی بہتری کے لئے ضروری بھی ہے لیکن اسے مطمع نظر نہیں بننا چاہیئے۔ سیاسی اقتدار کی خواہش معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کے جذبہ کے ساتھ ہم آہنگ ہونی چاہیئے۔

"پی پی ایل کے کارکنوں اور ان کے ہمنوا طالب علموں، مزدوروں اور پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی جس ولولہ انگیز جدوجہد کا آغاز سالِ نو کے ساتھ ہوا تھا، وہ بالآخر پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو کی یقین دہانی پر ختم ہو گئی۔ اپنے حافظے میں اِن خبروں کو تازہ رکھیئے اور مستقبل کی حکومت کی طرف سے یقین دہانیوں کی تکمیل کا انتظار کیجیئے۔"

جدوجہد کی کہانی، خبروں کی زبانی

لاہور۔ ۳ جنوری۔ پیپلز پارٹی کے رہنما جناب محمود علی قصوری نے تاج پورہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا سرمایہ داروں اور رجعت پرستوں نے مختلف اخباروں سے دیانتدار صحافیوں کو چن چن کر نکالنا شروع کیا ہے۔ انہوں نے پی پی ایل ورکرز یونین کے مطالبات کی حمایت کرتے ہوئے کہا پیپلز پارٹی مکمل طور پر صحافیوں کے ساتھ ہے۔

---

۴ جنوری۔ پی ایف یو جے کے سیکریٹری جنرل مسٹر منہاج برنا نے کہا اگر نکالے ہوئے صحافیوں کو صفدر میر کی بھوک ہڑتال سے قبل واپس نہ لیا گیا تو صورتِ حال بہت نازک ہو جائیگی۔ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ پی پی ایل کی مالی حالت کی تحقیقات کرے۔

---

۵ جنوری۔ پی پی ایل کی ایکشن کمیٹی نے بھوک ہڑتال کے سارے انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔ ۶ جنوری کو صفدر میر کا جلوس داتا دربار سے بھوک ہڑتالی کیمپ روانہ ہوگا اور عبدالحفیظ کاردار کا جلوس کرشن نگر سے روانہ ہوگا۔

"ہم بھوک ہڑتالیوں کے طرفدار ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مطالبات برحق اور مبنی بر انصاف ہیں۔ بھوک ہڑتال میں شرکت کے لئے پیپلز پارٹی کے جن رہنماؤں نے اصرار کیا ہے ان میں مولانا کوثر نیازی، مختار رانا، عبدالحفیظ کاردار کے علاوہ بہت سارے لوگ ہیں جن کی فہرست شائع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ طلباء، وکیل، ڈاکٹر، ادیب اور مزدور انجمنوں نے بھی پی پی ایل ورکرز یونین کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ہم پی پی ایل ورکرز یونین کی جدوجہد کو اپنی ہی جدوجہد کا ایک حصہ سمجھتے ہیں" لاہور کے شہریوں کا فرض ہے کہ وہ حالات پر غور کریں اور سوچیں کہ آج راوی نے فرات کا روپ کیوں دھار لیا ہے اور یہ خیمے کربلا سے اُٹھ کر لاہور کیوں آ گئے ہیں اور کون ہیں جو عوام کے قافلے کو لوٹنے کی سازش کر رہے ہیں۔" صفدر میر کا محاذ ایک علامتی محاذ ہوگا۔ اس میں فیصلہ ہوگا کہ کون کس کے ساتھ ہے اور کونسا طبقہ کس طبقے کا دشمن ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن عوام کی قیادت کرو اور مورچے پر پہنچو ہماری جنگ جاری ہے اور تمہاری قیادت کا امتحان بھی آج ہے۔

——— روزنامہ مساوات ۵ جنوری

---

۶ جنوری۔ پی پی ایل ورکرز یونین کے صدر جناب صفدر میر نے پاکستان ٹائمز اور امروز کے صدر دفاتر کے سامنے تادمِ مرگ بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ جناب صفدر میر اور عبدالحفیظ کاردار کی قیادت میں ایک عظیم الشان جلوس داتا دربار سے روانہ ہوا اور تقریباً چار بجے ہڑتالی کیمپ پہنچا۔

---

۷ جنوری۔ پی پی ایل ورکرز یونین کے صدر جناب صفدر میر محمد خاں، چودھری برکت علی، حامد جیلانی، انوار الحق اور مشتاق ناگی کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ جب پولیس ہڑتالی کیمپ میں داخل ہوئی تو کیمپ میں موجود صحافیوں، طالب علموں اور مزدور کارکنوں نے صفدر میر زندہ باد، توڑیں گے توڑیں گے پریس ٹرسٹ توڑیں گے، ہماری جدوجہد جاری رہے گی کے نعرے لگائے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی "اصولی کمیٹی" کے رکن جناب حنیف رامے نے اپنے کارکنوں سے کہا کہ وہ گلی گلی کوچے کوچے پھیل کر اعلان کر دیں کہ پیپلز پارٹی پی پی ایل ورکرز یونین کے ساتھ ہے اور یونین کے مطالبات منوا کر دم لے گی۔ انہوں نے کہا میرے "ویر" صفدر میر نے سر سے کفن باندھا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے صفدر میر نے سہرا باندھ لیا ہے اور مجھے ہڑتالی کیمپ میں وہ چوکھٹ دکھائی دی جہاں دُلھا بٹھائے جاتے ہیں۔ صفدر میر کی بارات میں پاکستان کے تیرہ کروڑ عوام شامل ہیں۔ ہمیں یہ جنگ جیتنا ہے، جیتنا ہے، جیتنا ہے۔!

محمود علی قصوری نے کہا پی پی ایل کا مسئلہ قومی اہمیت

کا مسئلہ ہے۔ پی پی ایل کو رجعت پسندوں سے چھین کر اس کے سابق مالکان کو واپس کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا بھوک ہڑتالیں مذاق میں نہیں کی جاتیں اگر پی پی ایل کے منتظمین کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں تو وہ آج اس عظیم مظاہرے کو دیکھ لیں۔ یونین کے مطالبات ہر حال میں پورے ہونے چاہئیں۔

عبدالحفیظ کاردار نے کہا عوامی عدالت لگ چکی ہے اگر شیخ آفتاب میں ہمت ہے تو وہ عدالت میں پیش ہوں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ کل سے بھوک ہڑتال میں شریک ہو جائیں گے۔

پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کے چیئرمین جناب شیخ رشید نے کہا صفدر میر کا جذبہ انقلابی جذبہ ہے اور ہر انقلابی اس جذبہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ انہوں نے پیپلز پارٹی کے کارکنوں سے کہا وہ اس جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

۸ر جنوری۔ صفدر میر اور ان کے ساتھ گرفتار ہونیوالوں کو کیمپ جیل کے ہسپتال میں رکھا گیا ہے جہاں تیسرے دن بھی ان کی بھوک ہڑتال جاری ہے۔ ان کا وزن اور خون کا دباؤ کم ہو گیا ہے۔ عبدالحفیظ کاردار اور ان کے ساتھیوں کی بھوک ہڑتال دوسرے دن میں داخل ہو گئی۔

قومی اسمبلی کے رکن اور پیپلز پارٹی لاہور کے چیئرمین ملک معراج خالد نے اعلان کیا کہ وہ پی پی ایل ورکرز یونین کی حمایت میں کسانوں کا جتھے کرائیں گے اور بھوک ہڑتال میں شامل ہو جائیں گے۔ مولانا کوثر نیازی نے کارکن صحافیوں کو مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ پیپلز پارٹی کے رہنما مختار رانا نے اعلان کیا کہ وہ ۱۱ جنوری سے بھوک ہڑتال میں شامل ہو جائیں گے۔ مختار رانا نے اعلان کیا کہ وہ ۱۱ جنوری کو لائل پور کے سینکڑوں مزدوروں کے ساتھ ٹرکوں پر ۱۱ جنوری کو ہڑتالی کیمپ پہنچیں گے

۹۔ جنوری۔ بھوک ہڑتالی صحافیوں کی گرفتاری کی مذمت میں کئی مزدور، طلبا انجمنوں کی طرف سے بیانات شائع ہوئے پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن گوجرانوالہ کے صدر غلام نبی بھلر، این، ایس، ایف کے زاہد امجد، عوامی فکری محاذ کے ڈاکٹر عبدالرؤف وغیرہ نے ان گرفتاریوں کی مذمت کرتے ہوئے، پی پی ایل ورکرز یونین کو اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔

پیپلز پارٹی کے رہنما اور قومی اسمبلی کے منتخب رکن جناب احمد رضا قصوری نے کہا۔ پیپلز پارٹی کا صحافیوں کے ساتھ یہ عہد ہے کہ وہ صحافت کو آزاد کرائے گی۔ انہوں نے بھوک ہڑتالی صحافیوں کی حمایت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ اتوار سے بھوک ہڑتال میں شامل ہو جائیں گے۔ عبدالحفیظ کاردار نے کہا ذوالفقار علی بھٹو کا قول ہے کہ انتخابات اور اسمبلیاں ہی عوام کے مسائل کا حل نہیں اسمبلیوں کے باہر بھی ان مسائل کا حل ہے ہم اسی قول پر عمل کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر پی پی ایل ورکرز یونین کے مطالبات تسلیم نہیں کئے گئے تو ہم مختار رانا کے اعلان کے مطابق پی پی ایل پر زبردستی قبضہ کر لیں گے

۱۱۔ جنوری۔ پی پی ایل ورکرز یونین کی حمایت میں مزید چھ افراد نے بھوک ہڑتال کر دی اب بھوک ہڑتالیوں کی تعداد ۲۸ ہو گئی۔ ان بھوک ہڑتالیوں میں پانچ پیپلز پارٹی کے رہنما ہیں۔ احمد خان قصوری نے بھی بھوک ہڑتال شروع کر دی انہوں نے اعلان کیا کہ ہماری جدوجہد اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک صحافیوں کے مطالبات مان نہیں لئے جاتے

پشاور ۱۱۔ جنوری۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی نے پی پی ایل ورکرز یونین کی مکمل حمایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ پیپلز پارٹی نے ہمیشہ صحافیوں کے مطالبات کی حمایت کی ہے۔ انہوں نے بھوک ہڑتالی صحافیوں کو پیپلز پارٹی کے بھرپور تعاون کا یقین دلاتے ہوئے کہا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑ دیا جائے۔

جمعیت العلماء اسلام کے جنرل سیکرٹری مفتی محمود نے پی پی ایل کے کارکنوں کو ظلم کا نشانہ بنانے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا حکومت اس معاملے میں فوری مداخلت کرے انہوں نے صحافیوں کو اپنی جماعت کے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

۱۲۔ جنوری، پی پی ایل کے مطالبات کے حق میں ہڑتال کرنے والے کاردار، احمد رضا قصوری، حامد یاسین اور مختار رانا کو ہڑتالی کیمپ سے اٹھا کر ناصر باغ میں منتقل کر دیا گیا جبکہ دوسرے بھوک ہڑتالیوں کو شہر سے دور لے جا کر چھوڑ دیا گیا۔ ہڑتالی کارکنوں کے خلاف گذشتہ رات پولیس کی کارروائی کے خلاف ناصر باغ کے قریب مظاہرہ کرنے والے ایک ہجوم پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ ناصر باغ کے اطراف مسلح پولیس کا سخت پہرہ لگا دیا گیا اور فوج گشت کر رہی ہے

مولانا کوثر نیازی نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ پریس ٹرسٹ کو توڑ دے اور پی پی ایل ورکرز یونین کے تمام مطالبات منظور کرے

لالہ موسیٰ۔ ۱۲ر جنوری۔ صفدر میر اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کے خلاف اور پی پی ایل ورکرز یونین کی حمایت میں این ایس ایف کے صدر سلیم جنجوعہ، پیپلز پارٹی کے رہنما جاوید افغانی اور مشتاق احمد نے لالہ موسیٰ میں بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ پیپلز پارٹی کے اعلان کے مطابق مزید چھ افراد بھوک ہڑتال میں شامل ہو جائیں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یونین کے تمام مطالبات تسلیم نہیں کر لئے جاتے۔

راولپنڈی۔ ۱۳ر جنوری۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کہا پی پی ایل عوام کی ملکیت بن کر رہے گا۔ انہوں نے پی پی ایل ورکرز یونین کے مطالبات کی مکمل حمایت کی۔

لاہور۔ ۱۳ر جنوری۔ پی پی ایل ورکرز یونین کے مطالبات کے حق میں خواتین نے پی پی ایل کے دفتر پر مظاہرہ کیا۔ مظاہرے کی قیادت احمد رضا قصوری کی والدہ کر رہی تھیں "پی پی ایل پر قبضہ کر لو" "گرفتار شدگان کو رہا کرو" کے نعرے لگائے گئے۔

پی پی ایل ورکرز یونین کی حمایت میں چار مقامات، گول باغ، پریس کلب، میو ہسپتال اور کیمپ جیل میں بھوک ہڑتال جاری ہے۔ ملک کے مشہور شاعر ادیب اور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن لائلپور کے سابق صدر نے پی پی ایل کے کارکنوں پر پولیس کے لاٹھی چارج کی مذمت کی، انہوں نے کہا اگر یونین کے مطالبات نہ مانے گئے اور گرفتار شدگان کو رہا نہ کیا گیا تو ملک گیر سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جائے گی۔

جناب مختار رانا، عبدالحفیظ کاردار، احمد رضا قصوری، حامد یٰسین نے ناصر باغ سے ایک پیغام میں کہا کہ ان کی جدوجہد مطالبات کی منظوری تک جاری رہے گی۔ تشدد کے ذریعہ ہمیں مرعوب نہیں کیا جا سکتا۔

راولپنڈی ۱۳ر جنوری۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہم صحافیوں کے مطالبات کی حمایت کرتے ہیں لیکن مظاہروں کی صورت میں صرف جماعت ہی اس کی اجازت دے سکتی ہے اور کوئی تو منتخب ممبر براہ راست اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ ایسا کرنے سے دوسرے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ پی پی ایل کی ہڑتال کے سلسلے میں انہوں نے کہا پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور اراکین قومی و صوبائی اسمبلیوں کی سرگرمیاں قابل مذمت ہیں۔"

لاہور ۱۴ر جنوری۔ پی پی ایل کے ملازمین اور پیپلز پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں نے آج آٹھ روزہ بھوک ہڑتال پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی درخواست پر ختم کر دی پیپلز پارٹی کے چیئرمین آج لاہور پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد گول باغ پہنچے جہاں ان کی پارٹی کے اراکین بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ جناب بھٹو نے بتایا کہ انہوں نے گورنر پنجاب سے ملاقات کی ہے جس میں انہوں نے "یقین دلایا" ہے کہ پی پی ایل کے برطرف شدہ ۱۸ ملازمین کو بحال کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا اس وقت قوم کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ دستور سازی ہے۔ اس مسئلہ کو دوسرے مسائل پر ترجیح دینا چاہیئے۔

ڈھاکہ ۱۴ر جنوری۔ صدر پاکستان آغا محمد یحییٰ خاں نے کہا کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ ادارہ ایک قانون کے تحت قائم کیا گیا ہے۔

انتخابی نتائج پر ایک نظر

محمد مصطفےٰ

یہ تمام ترقی پسند جمہوری طاقتوں کی کامیابی ہے

بائیں بازو کے امیدواروں نے مخالف امیدواروں سے کہیں زیادہ ووٹ حاصل کئے۔

اب سیاست جاگیرداروں کے محلوں سے نکل کر کوچہ و بازار میں آگئی ہے

ملک میں پہلے عام انتخابات عوام دشمن طبقوں یعنی سرمایہ داروں جاگیرداروں مذہب فروشوں اور دائیں بازو کے دیگر رجعت پسندوں کے لئے شرمناک شکست کا باعث ہوئے جس کے لئے یقیناً وہ تیار نہ تھے مگر مستحق ضرور تھے۔ اس "معرکے" کو سر کرنے کے لئے انہوں نے کثیر دولت خرچ کی۔ فتویٰ فروشی اور زہریلے پروپیگنڈے کے تمام حربے استعمال کئے مگر عوام نے انہیں مسترد کر دیا۔

ان انتخابات میں عوام دوست پارٹیوں کی عظیم الشان کامیابی میں بلاشبہ ان تمام کوششوں اور قربانیوں کا عمل دخل بھی ہے جو ہمارے ملک کی تمام ترقی پسند جمہوری طاقتوں نے ماضی میں عوام کے اندر سیاسی شعور بیدار کرنے کے لئے انجام دی ہیں۔

آزادی کے بعد سرمایہ دارانہ جمہوریت کا دور ہو یا ایوبی آمریت کے دن اس تمام عرصے میں سیاست، صحافت ادب یا ثقافت کے محاذ پر اور عوام کی طبقہ وارانہ تنظیموں کے درمیان جو بھی خدمات انجام دی گئیں ان سب کے نتیجے میں آمریت کے خلاف عوامی تحریک کو تقویت حاصل ہوئی اور پھر انتخابات میں عوامی فتح حاصل ہوئی۔

اسے ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جس طرح لکڑی یا دھات کا کوئی اوزار وائل تاریخ سے آج تک کے تمام محنت کشوں کی دماغی اور جسمانی محنت اور تجربات کا مرتکز اظہار ہوتا ہے اسی طرح کسی خاص وقت پر سماج میں عوام کے سیاسی شعور کی سطح ان تمام سرگرمیوں کا مظہر بن جاتی ہے جو گزشتہ عرصے میں بطور مجموعی اس کی نشوونما کے لئے انجام دی گئی ہوں۔ لہٰذا انتخابات میں عظیم الشان کامیابی کا سہرا کسی ایک فرد یا پارٹی کے سر اس طرح باندھنا کہ دوسرے ترقی پسندوں کی کوششیں اور قربانیاں نظروں سے اوجھل ہو جائیں درست نہ ہوگا۔ یوں ہی کسی ایسی پارٹی یا افراد کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے برسوں کی اس مقداری تبدیلی کو خصوصیات کے لحاظ سے تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہو۔ اس کے لئے ہم پیپلز پارٹی اور اس کے سربراہ جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی انتھک محنت اور جرأت کو نمایاں حیثیت دے سکتے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے اُسے تمام ترقی پسند جمہوری طاقتوں کی کامیابی تصور کیا جائے اور ان تمام جماعتوں کو جو ترقی پسند پروگرام کی حامل تو ہیں مگر انتخابات میں کامیاب نہیں ہوئیں ان کے بارے میں بھی یہ نہ سمجھا جائے کہ عوام نے ان کو رد کر دیا ہے۔ ان کی ناکامی کے اسباب کچھ اور ہیں اور یہ ایک الگ بحث ہے۔

ووٹنگ کے نتائج کا تجزیہ

طبقاتی سماج، خصوصاً سرمایہ دارانہ سماج میں معاشی ترقی غیر متوازن ہوتی ہے لہٰذا اسی نسبت سے عوام کے سیاسی شعور کی نشوونما ناہموار ہوتی ہے۔ انسانی خیالات براہ راست معاشی ڈھانچے کے تابع ہوتے ہیں اور سیاست اس معاشی ڈھانچے کا عکس ہوتی ہے اگر دیکھا جائے تو حالیہ انتخابات نتائج اس اصول کی بہترین تصویر پیش کرتے ہیں جس کا ذکر آگے آئے گا۔

ہمارے ملک کی تیرہ کروڑ آبادی میں بالغ حق رائے دہی کے تحت کل ساڑھے چھ کروڑ افراد ووٹروں کی فہرست میں درج تھے۔ ان میں سے اوسطاً ۶۰ فیصد لوگوں نے قومی یا صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں اپنا یہ حق استعمال کیا جس کی رُو سے ملک کی ترقی پسند جمہوری پارٹیوں یعنی عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی (کے دونوں گروپ) نے دائیں بازو کی پارٹیوں سے مجموعی طور پر زیادہ ووٹ حاصل کئے ہیں۔ اگر ان آزاد امیدواروں اور ہزاروی گروپ کے سامراج دشمن علماء کے حاصل کردہ ووٹوں کو دائیں بازو کے پلڑے میں اس لئے ڈال دیا جائے کہ ان ووٹروں نے ترقی پسند جمہوری طاقتوں کو واضح طور پر ووٹ نہیں ڈالے[1]، پھر بھی بائیں بازو کے امیدواروں کو ملنے والے ووٹوں کی مجموعی تعداد، اُن ووٹوں سے کہیں زیادہ ہے، جو دائیں بازو کی پارٹیوں کو ملے۔

لیکن بحث کی خاطر اگر محض ان ووٹوں کو بنیاد بنایا جائے جو واضح طور پر ترقی پسند جمہوری پارٹیوں کو ملے تو پھر بھی ووٹروں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جنہیں ہم خیال بنانے کا کام ابھی باقی ہے۔ یہ بات اس لئے بھی اہم ہے کہ عوام دشمنوں نے شکست ضرور کھائی ہے اور ان کے بڑے بڑے سرغنہ کھیت رہے ہیں، مگر انہوں نے یہ شکست تسلیم نہیں کی۔ اور جن طبقات کی یہ لوگ نمائندگی کر رہے تھے، وہ بدستور وسائل پیداوار پر قابض ہیں اور ان کی دولت و طاقت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لہٰذا عوام کے اتنے بڑے حصے کو اگر نظرانداز کر دیا گیا (جنہوں نے ترقی پسند طاقتوں کے پروگرام سے بوجوہ فی الحال اتفاق نہیں کیا) تو وہ عوام دشمن طبقوں کی آماجگاہ بن سکتے ہیں۔ اس صورتِ حال پر اس وقت تک نظر داری

[1] اس کی بیشتر وجوہ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کئی جگہوں پر ترقی پسند پارٹیوں کے اُمیدوار ہی نہ تھے، یا کئی جگہوں پر آزاد اُمیدواروں کو ان میں سے کسی پارٹی کی حمایت حاصل تھی، یا بعض آزاد اُمیدوار ان پارٹیوں میں شامل ہو گئے۔ ووٹ کا حق استعمال نہ کرنے والوں کی بھی ایک سے زائد وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ۲۱ سال سے کم عمر کے لاکھوں نوجوانوں کو اپنی رائے دینے کی اجازت ہی نہ تھی۔

نیشنل عوامی پارٹی نے مغربی پاکستان میں عوامی شعور کی تربیت کے لئے بڑی قربانیاں دی ہیں

(VIGILENCE) کی ضرورت رہے گی جب تک کہ وسائل پیداوار اور دولت کے سرچشمے عوام دشمن سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکرشاہی کے قبضے سے نکال کر عوام کی ملکیت نہیں بن جاتے اور عوام کی سیاسی تربیت اور طبقہ واری تنظیم کا کام تسلی بخش طور پر مکمل نہیں ہوجاتا کیونکہ عوام ہی ان وسائل کے حقیقی مالک ہیں۔

عوام کے ایک حصّے نے ترقی پسند جمہوری پارٹیوں کو ووٹ نہیں دیئے یا ان پارٹیوں کے پروگرام سے واضح طور پر اتفاق نہیں کیا۔ ایسا کیوں ہے، یہ جاننے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جن لوگوں نے ان پارٹیوں پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا، ان کے اس اعتماد میں کون کون سے عوامل کارفرما تھے۔

مشرقی پاکستان میں دونوں اسمبلیوں کے انتخابات میں عوامی لیگ نے بے مثال کامیابی حاصل کی ہے۔ اس صوبے کے عوام کی سیاسی تربیت کے لئے وہاں کے تمام ترقی پسند خصوصاً نیشنل عوامی پارٹی بہت عرصے سے کام کرتی رہی ہے اور کچھ عرصہ پہلے تک نیشنل عوامی پارٹی وہاں کی دوسری بڑی جماعت سمجھی جاتی تھی مگر کئی وجوہ کی بناء پر یہ تمام کوششیں عوامی لیگ کے کام آگئیں۔ نیشنل عوامی پارٹی پہلے دو واضح گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ اسکے بعد بھاشانی گروپ کے کئی حصّے ہوئے پھر بھاشانی گروپ نے انتخابات میں حصّہ نہیں لیا جبکہ ولی خان گروپ نے انتخابات میں حصّہ تو لیا مگر اسکا کوئی امیدوار منتخب نہیں ہوسکا۔ حالانکہ مزدوروں، کسانوں اور طلبار میں نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں گروپوں کی مضبوط اور وسیع طبقہ واری تنظیمیں آج بھی موجود ہیں۔ اس کے برعکس عوامی لیگ نے طلبار کے علاوہ مزدوروں کی طبقہ واری تنظیم کی طرف حال ہی میں توجّہ کی تھی۔

عوامی لیگ کی کامیابی

مشرقی پاکستان کے ان ترقی پسند حلقوں کے علاوہ خود عوامی لیگ میں خاصی بڑی تعداد میں ترقی پسند افراد شامل ہیں مگر عوامی لیگ کی اتنی زبردست کامیابی زیادہ تر قوم پرستی کے ان جذبات کی بدولت ہوئی جس میں مغربی پاکستان دشمنی کا پہلو نمایاں ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہاں کے مادی حالات اور معاشی اسباب ہیں۔ ایسے تنگ نظر قوم پرستانہ جذبات کا جواز موجود تھا جسے عوامی لیگ نے بڑی چابکدستی سے اُبھار کر استعمال کیا۔ ماضی میں مشرقی پاکستان کے ساتھ ناانصافیاں ضرور ہوئیں۔ مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس غیر متوازن منصوبہ بندی کی ذمّہ دار حکومتوں میں مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ مشرقی پاکستان کے راہنما بھی برابر کے شریک رہے خواہ وہ خواجہ ناظم الدین ہوں یا حسین شہید سہروردی اور محمد علی بوگرہ ہوں یا خود شیخ مجیب الرحمٰن صاحب۔ مگر عوامی لیگ نے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر مشرقی پاکستان کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کے ذمّہ دار مغربی پاکستان کے استحصالی طبقوں کو نشانہ بناتے وقت دشمنوں اور دوستوں کے درمیان واضح فرق نہیں کیا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ عوام دشمن طبقے یا ان کے نمائندے نہ صرف مشرقی پاکستان بلکہ مغربی پاکستان کے عوام کو بھی اسی شدت سے لوٹتے رہے ہیں، لہذا یہی لٹیرے قابلِ نفرت ہیں۔ مغربی پاکستان کے عوام نے مشرقی پاکستان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ دونوں بازوؤں کے عوام اس استحصالی گروہ کے مظالم کا شکار رہے ہیں (جس کی بیشتر تعداد بدقسمتی سے مغربی پاکستان میں مقیم ہے)۔

یہ خطرناک منفی رویّہ

عوامی لیگ کے اس منفی رویّے کا سب سے تشویشناک پہلو یہ ہے کہ جہاں مشرقی پاکستان کے عوام میں بلاتخصیص مغربی پاکستان کے کل عوام کے خلاف منافرت کے جذبات پیدا ہوئے وہیں رَدِّ عمل کے طور پر مغربی پاکستان کے عوام میں مشرقی پاکستان کے عوام کے لیے سرد مہری پیدا ہوتی گئی۔ ظاہر ہے کہ تنگ نظر قوم پرستی کے ان رجحانات کی وجہ سے مستقبل قریب میں عوام کے انقلابی عمل کی راہ میں کئی رکاوٹیں کھڑی ہو سکتی ہیں۔

جہاں تک عوامی لیگ کے منشور کا تعلق ہے اس میں — استحصال سے پاک معاشرہ قائم کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بنک اور کلیدی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے اور جاگیرداری اور سرمایہ داری کو ختم کرنے کے وعدے بھی شامل ہیں۔ البتہ خارجہ تعلقات اور سامراج کی مخالفت اور سامراجی ممالک کے قرضوں کے بارے میں کوئی واضح بات ان کے یہاں نہیں ملتی۔ عوامی لیگ ہندوستان کے ساتھ کشمیر اور فرخابند کے بنیادی تنازعے طے کئے بغیر تجارت اور دوستی کے حق میں ہے تاہم سوشلسٹ ممالک خصوصاً عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ دوستی بڑھانے کے بارے میں اِن کے یہاں کسی گرمجوشی کا اظہار نہیں ملتا۔

اِن حالات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام نے کسی حد تک سوشلزم اور اس کے ساتھ نیشنلزم کے ملے جلے جذبات کے تحت عوامی لیگ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی نے سندھ اور پنجاب میں عظیم الشان کامیابی حاصل کی ہے جو اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ عوامی لیگ کے برعکس یہاں کسی منفی نعرے کا سہارا نہیں لیا گیا۔

مغربی پاکستان میں بھی ترقی پسند افراد اور نیشنل عوامی پارٹی کے دونوں گروپوں کے ارکان نے عوام میں شعور پیدا کرنے کے لئے طویل عرصے تک بڑی قربانیاں دی ہیں مگر پاکستان پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو نے جرأت سے کام لے کر ہماری تہذیبی روایات کی روشنی میں بڑے پیمانے پر سوشلزم کا پرچار کیا جس کی وجہ سے گزشتہ برسوں کا سارا کام پیپلز پارٹی کے عمل کا حصّہ بن گیا۔ خاص طور پر پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی کے سوا کسی اور ترقی پسند جمہوری پارٹی کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پنجاب اور سندھ کے مفصل جائزے سے پیشتر دوسرے دو صوبوں کا ذکر کرلیں۔

بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی ولی گروپ کو کثرت سے ووٹ ملے مگر وہاں کے مخصوص مادی حالات یعنی معاشی پسماندگی اور پرانے پیداواری رشتوں کی بدولت کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی اور عوام نے پارٹی پروگرام سے زیادہ سرداری اور قبیلہ واری بنیادوں پر اپنا حق رائے دہی استعمال کیا یہ الگ بات ہے کہ وہاں ترقی پسند جمہوری طاقتوں کی راہنمائی زیادہ تر سردار صاحبان کر رہے تھے۔ سرحد میں صورتِ حال بلوچستان سے قدرے بہتر رہی۔ اس کے باوجود وہاں رجعت پسندوں کا خاصا زور رہا۔ وہاں کی قدیم سامراج دشمن روایات کی بدولت کچھ ووٹ جمعیت العلمائے اسلام (ہزاروی گروپ) کو ملے اور جدید رجحانات کے باعث کچھ ووٹ نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان پیپلز پارٹی کو حاصل ہوئے بطور مجموعی ان تین پارٹیوں کے ووٹوں کی تعداد دائیں بازو کے ووٹوں سے کہیں زیادہ ہے۔

سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی یا دوسرے ترقی پسند امیدواروں کو خاصی تعداد میں ووٹ ملے۔ مگر پارٹی پروگرام یا نظریاتی بنیادوں پر نسبتاً کم ووٹ آئے۔ عام طور پر پرانے طریقے کے مطابق وڈیروں اور پیروں کو اُن کے شخصی اثر و رسوخ کی بناء پر ووٹ ملے البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کامیاب ہونے والوں میں چند روشن خیال جاگیردار بھی شامل تھے مگر ان لوگوں کو ان کے طبقاتی مفادات سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ سندھ میں بھی معاشی پس ماندگی نے بنیادی کردار ادا کیا۔ جس کی بدولت جدید رجحانات کے بارے میں عوام کا سیاسی شعور ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پیپلز پارٹی کو کام کرنے کا بہت کم وقت ملا اور باقی ترقی پسند عناصر نے یہاں بڑے پیمانے پر عوام میں کام ہی نہیں کیا۔

پنجاب میں پاکستان پیپلز پارٹی کی عدیم المثال کامیابی کے

لحاظ سے اہم ہے۔ یہ درست ہے کہ پنجاب کی زیادہ تر آبادی معاشی اور سیاسی لحاظ سے مغربی پاکستان کے دوسرے تین صوبوں کی نسبت سے زیادہ آسودہ اور ترقی یافتہ ہے اور یہاں خواندگی کی شرح بھی نسبتاً زیادہ ہے! اسی طرح شہری اور دیہی علاقوں میں متوسط طبقے کے لوگ زیادہ ہیں مگر پھر بھی پنجاب کا بیشتر علاقہ سندھ، بلوچستان کی طرح بڑے بڑے باجبروت جاگیرداروں کے قبضے میں ہے۔ جنھوں نے آج تک یہاں بلا شرکت غیرے حکمرانی کی ہے۔

اسی طرح پنجاب میں اگر پڑھے لکھے افراد کی تعداد زیادہ ہے تو اسی نسبت سے یہاں رجعت پسندوں اور مذہب فروشوں کے مراکز بھی زیادہ ہیں اور عوام کے شعور کو کند کرنے کے لئے زہریلے پراپیگنڈے کے سوتے بھی یہیں سے زیادہ پھوٹتے ہیں۔

ان تمام مشکلات کے باوجود پیپلز پارٹی نے مثبت پروگرام، نئی قیادت اور ان تھک محنت کی بدولت بہت تھوڑے عرصے میں اپنے لئے نئی جگہ پیدا کرلی ہے۔

پیپلز پارٹی پنجاب میں

پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت نے ملک گیر پیمانے پر مغربی سامراج خصوصاً امریکی سامراج کے ناپاک عزائم، انڈونیشیا اور ویت نام میں اس کے جرائم، امریکی سامراج کے پٹھو اسرائیل کی جارحیت اور فلسطینی عوام اور عرب اقوام پر اس کے مظالم کے بارے میں شد و مد سے پرچار کیا۔ کشمیر کے حوالے سے بھارتی رجعت پسند حکمران طبقے کی جارحیت اور پاک چین دوستی کی اہمیت مسٹر بھٹو کی تقریروں کا بطور خاص موضوع رہی جس کی بدولت انھوں نے پنجاب کے عوام کے دلوں میں گھر کرلیا۔ کیونکہ ایک تو ستمبر ۶۵ء کی جنگ کا زیادہ تجربہ براہ راست پنجاب کے عوام کو ہوا تھا پھر یہ کہ مشرقی پنجاب کے فساد زدہ عوام کی اکثریت وہیں آباد ہے اسی لئے کشمیر کے مسئلے کے ساتھ ان کا جذباتی تعلق بھی اوروں کی نسبت زیادہ تھا۔ ایوب خاں کی آمریت کے خلاف تحریک جو زیادہ تر پنجاب سے شروع ہوئی اس میں پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کی ثابت قدمی نے بھی ان کی قدر و منزلت بڑھادی۔ پیپلز پارٹی کے منشور میں بھی سرمایہ داری اور کسی حد تک جاگیرداری کو ختم کرنے، بنک اور بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے اور ملک سے بھوک، بیماری، افلاس اور بے روزگاری دور کرنے کے وعدے شامل ہیں۔ مسٹر بھٹو نے بڑے سرمایہ دار جاگیردار رجعت پسند طبقوں کے خلاف جد و جہد کا پرچار کیا جس کی بدولت پنجاب کے عوام نے ان کی ذات اور اسی حوالے سے پیپلز پارٹی کے پروگرام پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ اور پیپلز پارٹی نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ سوشلزم کے ساتھ عوام کا تعلق ابھی جذباتی وابستگی کی سطح سے بلند نہیں ہوا۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی کے اکثر و بیشتر کامیاب اُمیدوار متوسط طبقے کے افراد ہیں یعنی سیاست اب جاگیرداروں کے محلوں سے نکل کر کوچہ و بازار میں آگئی ہے۔

اب دوسری طرف آیئے:۔

ملک کی وہ آبادی جس نے ترقی پسند جمہوری پارٹیوں کو ووٹ نہیں دیئے یا اُن کے پروگرام سے اتفاق نہیں کیا تو ان میں سے بڑے زمینداروں، سرمایہ داروں، مفاد پرستوں، ٹھیکیداروں، مذہب فروشوں اور ہٹ دھرم رجعت پسندوں کو چھوڑ کر عوام کی اکثریت نے ان کے زہریلے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ان پارٹیوں کے پروگرام پر اعتماد نہیں کیا اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ ملک کا تقریباً تمام پریس، ریڈیو، ٹی وی عوام دشمنوں کے قبضے میں تھے لہٰذا انہوں نے اپنے مادی اور افرادی وسائل کو بھرپور طریقے سے متحرک کر کے سارا زور سوشلزم اور ترقی پسند جمہوری طاقتوں پر کیچڑ اچھالنے، افواہیں پھیلانے اور عوام کو فریب دے کر موجودہ انتخابات کو کفر اور اسلام کی جنگ ثابت کرنے اور اُن کی معاشی جد و جہد کا مذاق اُڑانے میں صرف کردیا۔ لہٰذا ان کی شکست اس بات کی مظہر ہے کہ عوام کی اکثریت نے ان کے پروپیگنڈے کو مسترد کردیا۔

اس تجزیے کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسند جمہوری طاقتوں کے اصل کام کا آغاز اب ہوا ہے لہٰذا بڑے پیمانے پر کام کرنے کے لئے اُن تمام عوامل کو پیش نظر رکھنا ہوگا جن کی بنا پر رجعت پسند طبقے خود کو دوبارہ منظم کرنے کی کوشش کرینگے۔

ترقی پسند پارٹیوں کے منشور اور

پروگرام پر پوری طرح عمل درآمد

کے لئے موجودہ نظام کو تبدیل

کرنا ضروری ہے

مگر عوام کی سیاسی تربیت اور ان کی طبقاتی تنظیم کا کام محنت اور لگن کے ساتھ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ ترقی پسند طاقتوں کی صفوں میں اتحاد اور خیالات کی ہم آہنگی بدرجہ اتم موجود ہو۔ ہم نے دیکھا کہ گذشتہ حالات کے بارے میں جہاں رجعت پسندوں کے تمام اندازے اُلٹے ہوگئے وہاں بعض ترقی پسند حلقوں کے تجزیئے بھی بری طرح غلط ثابت ہوئے۔ حد تو یہ ہے کہ بعض ترقی پسند افراد ایوب خاں کی آمریت کے خلاف عظیم عوامی ابھار کو ابھی کل تک تخریب پسندی کا نام دیتے رہے اور بعض دوسرے حضرات کے تجزیاتی چوکھٹے میں عین انتخابات کے دن تک یہ بات فٹ نہ ہو سکی کہ آیا انتخابات ہوں گے بھی یا نہیں۔

ضروری بات یہ ہے کہ اب نہ صرف ماضی کی غلطیوں کے بارے میں تحقیق کی جائے بلکہ آئندہ حالات کے قطعی معروضی تجزیے کی بنیاد پر لائحہ عمل طے کر کے عوام کی سیاسی تربیت اور تنظیم کا فریضہ پوری سخت کوشی کے ساتھ انجام دیا جائے۔

ترقی پسند پارٹیوں کے کام

جن ترقی پسند پارٹیوں میں جاگیردار، سرمایہ دار یا دیگر طبقوں کے افراد بھی شامل ہوں، ان پارٹیوں میں دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات کی کشاکش لازماً رہتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کشمکش میں باشعور کارکن متوازن راہِ عمل اختیار کر کے مراعات یافتہ طبقات کے افراد کو پارٹی منشور کے خلاف رجعت پسندی کی طرف جانے سے کس حد تک روک سکتے ہیں اور پارٹی پروگرام اور منشور کے ترقی پسند نکات پر کہاں تک عمل کرواسکتے ہیں۔

ان انتخابات میں کامیاب ہونے والی تینوں ترقی پسند پارٹیوں کے منشور اور پروگرام پر پوری طرح عملدرآمد اسوقت تک ممکن نہیں جب تک موجودہ نظام کو یکسر تبدیل نہ کردیا جائے کیونکہ موجودہ ریاستی ڈھانچے کے تحت جمہوریت کی کوئی بھی قسم اس نظام کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ پارٹیاں اس بات کی کوشش کریں گی کہ بنک، انشورنس کمپنیاں اور بڑی صنعتیں اس لئے قومی ملکیت میں لے لی جائیں تاکہ مطلوبہ صنعتی ترقی کے ساتھ صرف سرمایہ داروں کی تجوریاں نہ بھریں بلکہ عوام کو بھی مناسب فائدہ پہنچے، دوسری طرف یہ ہوسکتا ہے کہ بڑی بڑی جاگیرداریوں کو کم کر کے ان کی فالتو زمین (ممکن ہے معاوضے کے ساتھ) حاصل کر کے بے زمین کسانوں میں مفت یا معمولی قیمت کے عوض قسطوں پر تقسیم کردی جائے ـــ اور ان جاگیرداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ معاوضے میں حاصل ہونے والے سرمائے سے نئی صنعتیں قائم کرنے میں مدد دیں۔ اس سے نہ صرف سرمایہ کاری کو فروغ ہوگا بلکہ دیہی اور شہری آبادی میں بیروزگاری کا کسی حد تک ازالہ ہوسکے گا۔ اس سے بیشتر ملکی آبادی کی قوت خرید بھی بڑھے گی جو صنعتوں کے مزید فروغ میں مددگار ہوگی۔

بہرحال یہ ایک الگ بحث ہے کہ یہ ترقی پسند پارٹیاں موجودہ نظام میں کس حد تک تبدیلیاں پیدا کرسکتی ہیں مگر تبدیلیوں کی گنجائش جس حد تک بھی نکل سکی اس کے لئے زبردست جد و جہد کی ضرورت ہوگی جو عوام کو منظم اور متحرک کئے بغیر ممکن نہ ہوگی۔

سوشلزم کے ساتھ عوام کا تعلق ابھی جذباتی وابستگی کی سطح سے بلند نہیں ہوا

افسانہ

نیا سال پرانے گھاؤ

از:- ڈینا چاگورج
ترجمہ: نعیم آروی

دیکھو میرے جسم سے دکھوں کی جمی ہوئی برف پگھلنے لگی ہے

وہ ختم ہونے والے سال کا آخری دن تھا۔

بے داغ آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں سورج پوری آب و تاب سے دمک رہا تھا۔ شمالی پہاڑ کی جنوبی ڈھلانیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ مگر ان کی چوٹیوں پر برف پگھلنی شروع ہو چکی تھی۔ قحط اور بھوک اور لاغری کا شکار ہونے والے جانور پہاڑ کی بلندیوں پر اس عمل کے شروع ہوتے ہی اپنے اندر پھر سے نئی زندگی کی حرارت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ سرما کی برف باری، ان پر قحط اور بھوک بن کر نازل ہوتی ہے۔ ساری زمین، سارے پہاڑ برف سے ڈھکنے کے بعد مردے کے کفن کی مانند سفید اور ساکت ہو جاتے ہیں۔ اس موسم میں جانوروں کو غذا کی تلاش میں سینکڑوں میل بھٹکنے کے بعد بھی کچھ نہیں ملتا۔

"سردی کے ٹھٹھرے ہوئے دن ختم ہونے والے ہیں۔ ہاں، اب بہار کے حسین دن آنے والے ہیں۔" سریمانا نے گہری ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے سوچا۔ "موسم بہار کی حیات بخش چمکیلی دھوپ میری بے کیف زندگی پر کب بکھرے گی؟"

موسم صاف اور بے حد پُرکیف تھا۔

ایک معمولی کسان اور چرواہے کی لڑکی سریمانا متمول وگدین کے خیمے میں بے حد اُلجھے اُلجھے، پریشان خیالات میں گھری بیٹھی تھی، پہاڑ کی ڈھلانوں پر پھیلی ہوئی برف کی سفید چادریں۔ اس کا جی چاہتا تھا قلانچیں بھرتی ہوئی اس جگہ پہنچ جائے، اور سفید برف کو اپنی مٹھی میں بھر کے ہوا میں بکھیرے اور وادی میں چلاتی پھرے۔ "دیکھو میرے جسم سے دکھوں کی جمی ہوئی برف پگھلنے لگی ہے۔" یہاں پہنچ کر جب اسے اصل حقیقت کا خیال آتا تو آس اور اُمیدوں کا بھرا ہوا غبارہ ایک دم سے پھٹ جاتا اور اس کا پورا وجود ایک بار پھر زندگی سے مایوس کر دینے والے خیالات کے بھنور میں ڈوب جاتا۔

سریمانا ایک انتہائی غریب چرواہے کی لڑکی تھی، اس کے والدین نے اسے شہر میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا تھا اور وہ تین سال سے ایک امیر آدمی وگدین کے گھر میں کام کر رہی تھی۔

ان تین برسوں میں اس پر جو کچھ بیتی اسے بیان کرنا انتہائی مشکل ہے اس گھر میں اس پر ظلم اور اذیتوں کے جو پہاڑ توڑے گئے اُن کا شمار بھی مشکل ہے۔ مالکن نے اُسے ذہنی اور جسمانی تکلیفیں دینے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ مگر یہ سوچ کر کہ اگر ایسا نہ ہوا تو کہیں اس سے بدتر حالات کا شکار نہ ہونا پڑے وہ ہمیشہ خاموش رہتی اور چپ چاپ آنسو بہا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی۔

کئی سال گذر گئے مگر سریمانا اب بھی وگدین کے گھر میں ایک بے کس ملازمہ کی حیثیت سے دن کاٹ رہی تھی۔ اس کی زندگی میں آرام نہ تھا، غموں کی شدید بارش تھی۔ اس دوران میں وگدین کی بیوی اس کی زندگی میں مشکلات کا زہر گھولتی رہی۔ اور اُسے کبھی چین لینے نہ دیا۔

★★★★★★★★★★★★

نیا سال قریب تھا۔ مگر حالات میں ذرا برابر تبدیلی نہ ہوئی سریمانا کو سونے کے لئے مشکل سے موقع ملتا۔ رات کو کھانا پکانے سے فرصت ملتی تو کپڑے سینے بیٹھ جاتی۔ اور صبح تک سلائی کڑھائی میں مصروف رہتی۔

آج وہ بہت تھک گئی تھی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد سے چیخ رہا تھا۔ اس نے بستر سے کئی بار اُٹھنے کی کوشش کی، مگر ہر بار ناکام رہی۔ اس نے لیٹے لیٹے خیمے کی جھریوں سے دیکھا، باہر نئے دن کی چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور ساری فضا نکھری نکھری اور تر و تازہ دکھائی دے رہی تھی۔ اسے اپنا خیمہ یاد آ گیا۔ اپنی ماں یاد آئی اور اپنے باپ کا چہرہ نظر آیا۔ وہ ایسے ہی ایک بے حد چمکیلے اور بے حد صاف دن کی روشنی میں اپنے خیمے کے باہر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ پرانے دن کی یاد نے اسے اداس کر دیا تھا۔ وہ کچھ زیادہ تھکن محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے نظریں پھیر کر اپنے بوسیدہ اور بے حد شکستہ خیمے کو دیکھا، جس میں جگہ جگہ سوراخ ہو گئے تھے، ٹھیک اسی لمحے وگدین کی بیوی اپنے سفید اور مضبوط خیمے سے برآمد ہوئی اور تیر کی طرح اس کے چھوٹے سے خیمے میں داخل ہو کر بڑے زور سے چلائی۔ "بدذات، کمینی، کیا میں نے تجھے دری جھاڑنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اور تو یہاں پڑی پڑی چارپائی توڑ رہی ہے۔ کیا تجھے علم نہیں کہ کل سالِ نو ہے"؟

اتنا کہنے کے بعد وگدین کی بیوی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی اور ایک موٹی چھڑی اُٹھا کر سریمانا پر پل پڑی۔ اور مار مار کر اس بے چاری کو ادھ موا کر دیا۔

سریمانا چلا چلا کر دہائی دیتی رہی۔ "مالکن رحم، رحم میرے سر میں سخت درد ہے، میرا جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہے۔ بس میں اٹھنے والی تھی۔ رحم کرو، اب ایسا نہ ہوگا۔"

★★★★★★★★★★★★

وزنی دری جھاڑتے وقت، اُسے کھڑکی میں سے پانچ بڑی بڑی دیواروں والا مکان نظر آیا۔ وہ مکان وگدین کی لڑکی میادگما کا تھا۔ جو گذشتہ سال مکمل ہوا تھا۔ سریمانا نے دیکھا۔ وگدین کی لڑکی اپنے مرصّع کمرے میں بڑے سے آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی چہرے پر پاؤڈر مل رہی تھی۔ میک اپ سے فارغ ہونے کے بعد گہرے سبز رنگ کا کوٹ پہن کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ دوسرے کمرے سے میادگما کے گانے کی مدھم، بے سُری آواز آ رہی تھی۔ وہ سیٹی پر کوئی بے نام دھن بجا رہی تھی، اُس نے سریمانا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو جب مہمان پہنچ جائیں تو انہیں بائیں طرف کے کمرے میں پہنچا دینا۔"

سریمانا نے حسرت بھری نگاہوں سے میادگما کے خوبصورت ریشمی لباس کو دیکھا اور پھر اپنے بوسیدہ پیوند لگے کوٹ پر نظر ڈالی۔ اس کی اپنی اور میادگما کی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق نظر آیا۔ ایک طرف بے فکری، خوشحالی اور زندگی کی تمام خوشیاں تھیں دوسری طرف دکھوں اور غموں کا انبار تھا۔ آہیں تھیں، چیخیں تھیں اور کراہیں تھیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ وہ اپنے

معاصر ادب

زیرِ نظر افسانہ منگولیا کے معاصر ادب کا ایک نمونہ ہے۔ لیل و نہار، اس عنوان کے تحت مختلف ملکوں کے افسانوی ادب کے تراجم اپنی آئندہ اشاعتوں میں پیش کرتا رہے گا۔

ذہن سے سارے خیالات جھٹک کر دوبارہ درس صاف کرنے میں مصروف ہوگئی۔

"تقریب کے موقع پر سارے آقا نئے لباس پہنتے ہیں" ۔ سریانا نے سوچا کھانے کی میز پر لذیذ کھانوں سے بھری ہوئی کشتیاں رکھی ہوتی ہیں۔ اور پھر۔ پھر اشتہا انگیز شراب کے جام گردش میں آتے ہیں اور لوگ بھوکے گدھ کی طرح کھانوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ آخر میرے حصے میں پرانا کوٹ بوسیدہ خیمہ اور دکھ بھرے دن کیوں آتے ہیں"۔

★★★★★★★★★★★★

دوسرے دن، صبح ہی صبح وہ بچے کھچے باسی روٹی کے ٹکڑے چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور پھلوں کے گلے سڑے چھلکے ٹوکری میں ٹھونس ٹھونس کر بھرتی اور پھر اس ٹوکری کو اپنے کندھے پر لٹکا کر گھر سے بہت دور لے جاکر گڑھے میں ڈال آتی تھی ہر تقریب کے بعد اس کا یہ معمول تھا۔ اس میں معمولی سی تبدیلی اس کے اپنے بس کی بات نہ تھی، بعض اوقات بچے کھچے کھانے کی بو سے اس کا دماغ پھٹنے لگتا۔ اور اس پر متلی کا دورہ پڑنے لگتا تھا۔ اس دوران میں وہ کبھی کبھی جھاڑیوں کے اس پار گھوڑے کے اصطبل کو ضرور دیکھ لیتی تھی جہاں مضبوط قد کاٹھ کا نوجوان سلتم گھوڑوں کی مالش کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ سائیں سلتم سریانا کی تنہا اور دکھوں سے بھری ہوئی بے کیف زندگی کا واحد سہارا تھا۔

دونوں عرصہ سے ایک دوسرے میں دلچسپی لے رہے تھے سریانا تو اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی، سلتم سریانا کے آنے والے اچھے اور خوشگوار دنوں کی امید تھا۔ دونوں کے خیمے قریب تھے۔ مگر دونوں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ ابھی تک کم نہ ہوا تھا کیونکہ دونوں کے آقا ایک پرانی کہاوت پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ "سادہ لوح دیہاتی خوشیوں کا مفہوم نہیں سمجھتے اور غریبوں کو محبت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا"۔

دونوں کے آقا، ان کی محبت سے آگاہ تھے۔ اور اکثر دشمنیزان کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ظالموں نے ان پر کڑی پابندی عائد کر رکھی تھی اور دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیا جاتا تھا۔

آقاؤں کی کڑی نگرانی اور سخت پابندی کے باوجود ایک دن سلتم اور سریانا کو ایک دوسرے ملنے کا موقع مل گیا۔ وہ بہت خوشگوار دن تھا۔ دھوپ کی کرنیں، پہاڑ کی چوٹیوں کا منہ چوم رہی تھیں۔ برف آہستگی کے ساتھ پگھل رہی تھی۔ میادگما کے مکان سے ہنسنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دونوں نے خوب باتیں کیں۔ خوب گھلے ملے اور ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے اپنی میٹھی میٹھی باتوں میں زندگی کے سارے دکھ، سارے زہر چھپالئے تھے۔ یہ دونوں کی پہلی طویل اور اثر انگیز ملاقات تھی۔

سلتم نے اچانک اپنی قمیص کے اندر سے تہہ کیا ہوا ایک ریشمی رومال نکالا اور وارفتگی کے عالم میں سریانا کے گلے میں باندھ دیا۔ یہ تحفہ میادگما کے ریشمی کوٹ سے کہیں زیادہ قیمتی تھا سریانا نے ریشمی رومال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی"۔

> آقاؤں کی کڑی نگرانی اور سخت پابندی کے باوجود ایک دن سلتم اور سریانا کو ایک دوسرے سے ملنے کا موقع مل گیا۔ وہ بہت خوشگوار دن تھا۔ دھوپ کی کرنیں، پہاڑ کی چوٹیوں کا منہ چوم رہی تھیں۔ برف آہستگی کے ساتھ پگھل رہی تھی۔ میادگما کے مکان سے ہنسنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

دوسرے دن سال نو کے موقع پر میادگما نے اپنی روایتی فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنا کوٹ سریانا کو دیتے ہوئے کہا "تو یہ پہن لو نئے سال کا ہماری طرف سے تحفہ"۔

سریانا نے اس کے کوٹ کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "پہن لوں گی، ابھی جلدی کیا ہے"۔ میادگما چلی گئی تو سریانا نے کہا"۔ اب تمہارا اترن شاذ کبھی نہ پہنوں"۔ میادگما جوں ہی کمرے سے باہر نکلی وگدین کی بیوی دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی سریانا کے ہاتھ میں ریشمی رومال دیکھ کر ایک دم سے بھڑک اٹھی "ارے نجم جلی، یہ کس نے دیا ہے تجھے یقیناً ہمارے مہمانوں میں سے کسی کا دیا ہوا تحفہ ہے جسے تو نے چرا لیا"۔

سریانا اس بے بنیاد الزام پر تلملا گئی، مگر اس وقت سچ بولنا بھی کم خطرناک بات نہ تھی۔ سلتم کا نام لیتے ہی وہ اس پر بھوکے گدھ کی طرح ٹوٹ پڑتی۔ اور مار مار کر اس کا بدن نیلا کر دیتی، لہٰذا وہ خاموش رہی۔

گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ سال نو کی تقریب اپنے شباب پر تھی۔ پورا گھر بات چیت کے شور اور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ سریانا سسکیاں بھرتی ہوئی فراقی پان پر کوئی چیز تل رہی تھی۔ اس رات وہ سو نہ سکی۔ رات بھر دوسرے دن کا کھانا پکانے میں مصروف رہی، دوسرے دن بھی مہمانوں کا تانتا بندھا رہا۔ وہ مہمانوں کو کھانے کے کمرے میں پہنچاتی رہی اور ان کے لئے انواع اقسام کے کھانے میزوں پر چنتی رہی کبھی کبھی چند لمحوں کے لئے اگر مہلت مل جاتی تو وہ کسی دیوار کا سہارا لے کر ان لوگوں کو دیکھنے لگتی جو زرق برق لباس پہنے ہوئے نا ؤ و نوش میں مصروف تھے اور دیوانہ وار قہقہے لگا رہے تھے۔

★★★★★★★★★★★★

دو سال مزید گذر گئے، ایک بار پھر سال نو کی آمد آمد تھی وگدین کا خاندان کسی وجہ سے شہر سے باہر جا رہا تھا۔ وگدین کی بیوی سریانا کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی، لیکن ایک دن اچانک سلتم نمودار ہوا، اس نے بڑی نرم آواز سے سریانا کو پکارا، سریانا جب اپنے بوسیدہ خیمے سے باہر نکلی تو سلتم نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میرے ساتھ آؤ، اب ہم دونوں اکٹھے رہیں گے"۔

وگدین کی بیوی نے بہت شور مچایا خوب چیخی چلائی وگدین نے ایک بار آگے بڑھ کر اپنی جسمانی طاقت کا مظاہرہ بھی کرنا چاہا، مگر سلتم کے مضبوط جسم اور بھرے بھرے بازوں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ سلتم سریانا کو اپنے ساتھ لے کر اس جہنم سے روانہ ہو گیا۔ جہاں سریانا سالہا سال سے سلگ رہی تھی، اس بار سال نو کے موقع پر سریانا اپنی زندگی میں پہلی بار رات بھر میٹھی نیند سونے کے بعد سلتم کے بوسیدہ خیمے سے باہر نکلی تو اس کے جسم کا جوڑ جوڑ آسودگی اور طمانیت میں ڈوبا ہوا تھا۔



لیڈران کرام

(۲۵ انٹرویو ۔ سوانحی خاکے)

از :۔ ریاض بٹالوی
التحریر لاہور ۔ اردو بازار، کبیر اسٹریٹ
صفحات ۳۲۶ ۔ قیمت ۵۰/۰، روپے

پاکستان میں حالیہ انتخابات نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ قومی اور علاقائی سیاسی زندگی میں، وہ کون لوگ ہیں، جو فی الواقعی عوام میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور ان کے افکار و خیالات کی قدر و قیمت محسوس کی جاتی ہے اور کون لوگ ہیں جو یادش بخیر کبھی معروف رہے ہوں گے، البتہ ان کے نام عوام کے حافظوں سے کب کے محو ہو چکے ہیں، یہ لوگ اِدھر کچھ دنوں اگر زندہ رہے تو محض اخباروں میں، جن کے خبر ساز اور مبصر وقت کی رفتار سے بے خبر اور حالات کی تبدیلی سے بے پروا، محض روایتی انداز میں ان کے ناموں کی لکیر پیٹتے چلے جا رہے تھے۔ کیسے کیسے "لیڈران کرام" ہیں ۔ ابوالاعلیٰ مودودی، احتشام الحق تھانوی، ایئر مارشل اصغر خاں، چودھری خلیق الزماں، جی۔ ایم۔ سید، بیگم شاہنواز، فضل القادر چودھری، مشتاق احمد گورمانی، میاں منظر بشیر، نوابزادہ نصر اللہ خاں وغیرہ وغیرہ۔ ان میں دو بڑے اہم نام، جنرل سرفراز اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے رہ گئے ہیں اور وہ غالباً اس لئے کہ لاہور کے انتخابی معرکے سے چند ہفتے قبل جب کوئی اخباری دستاویز، ان کے تذکرے کے بغیر مکمل قیاس نہیں کی جاتی تھی، یہ کتاب شائع ہو گئی۔ اگر یہ دو نام بھی شامل ہو جاتے تو سیاسی آثارِ قدیمہ کی یہ دستاویز مکمل ہو جاتی۔ اور گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را کے مصداق، اسکے مطالعے کی سفارش کی جاتی۔

بہرحال، ان نام نہاد رہنماؤں کی نسبت سے اگر "لیڈرانِ کرام" کی اضافت محض بطور طنز وضع کی گئی ہے (اور زبان سے مصنف کی لاعلمی کی بنا پر ایسا نہیں) پھر تو ٹھیک ہے، ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس مجموعے کا بیشتر حصہ بدلے ہوئے حالات میں اب اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ یہ بیشتر لوگ جو انٹرویو کی عبارت میں بڑے محترم اور مقدس بنا کر پیش کئے گئے ہیں اور اس یقین سے گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، جیسے قوم کے حال اور مستقبل کا ان سے زیادہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا، پرلے درجے کے خود غلط اور کوتاہ اندیش ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کی عوام دشمن سیاست کا اب جنازہ نکل چکا ہے۔ ان میں سے بیشتر "شخصیتیں" وہ ہیں، جن کا نہ کوئی ماضی تھا اور نہ حال ہے۔ مثلاً نصر اللہ خاں اور منظر بشیر "مقبوضہ اخبارات کے دھواں دھار پروپیگنڈے" سے انہوں نے ظہور کیا اور اسی دھوئیں کے ساتھ فضا میں تحلیل ہو گئے۔

انٹرویو کے لئے سیاسی رہنماؤں کے انتخابات، ان کے تعارف اور سوالوں کے تعین میں مصنف کا نقطۂ نظر ہر جگہ نمایاں ہیں اور یہ بالکل فطری سی بات ہے۔ بائیں اور دائیں بازو کی آویزش میں ان کا اخبار (مشرق جس میں یہ انٹرویو شائع ہوئے تھے)، صریحاً دائیں بازو کا ہراول بنا ہوا تھا۔ چنانچہ مصنف نے صحافتی غیر جانبداری کے باوجود، دائیں بازو کی عصبیت برقرار رکھی ہے اور حسبِ دلخواہ جواب حاصل کرنے کے لئے بعض لوگوں سے سوال بھی اپنے ڈھب کے پوچھے ہیں۔ مثلاً مولانا احتشام الحق تھانوی سے یہ سوال :۔

ملک کے متعدد سیاسی لیڈروں اور بعض علمائے سوشلزم کے خلاف علمائے کرام کے فتوی کو سیاسی فتویٰ قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں آپ کی کیا رائے ہیں؟ یا

بھٹو صاحب اسلامی سوشلزم کو اسلامی مساوات کا نام دیتے ہیں۔ کیا اسلامی مساوات کی یہ تعبیر درست ہے؟ یا

مودودی صاحب سے یہ سوال کہ آج کل جلسوں میں ہنگامہ آرائی اور تشدد پیدا کرنے والے عناصر کا اصل مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

ان سوالوں کے جواب سب کو معلوم ہیں۔ پوچھنے کا تکلف نہ ہی کیا جاتا تو بہتر تھا۔

موج صدا (شاعری)

جمیل یوسف
ناشر ۔ آئینہ ادب، چوک انارکلی، لاہور
صفحات ۔ ۱۹۱ (۱۹۱ غزلیات)
قیمت ۔ ۵٫۰۰ روپے

جمیل یوسف کی غزل روایتی اور جدید طرزِ سخن کا امتزاج ہے۔ انہوں نے کچھ تو پرانے مضامین سے افادہ کیا ہے اور کچھ انہی مضامین کو اپنے تجربے کی آمیزش سے نکھارا ہے۔ ان کی آواز، بہرطور نئی ہے۔ اگرچہ مانوس ہے، اجنبی نہیں۔ ان کی علامتیں، تلمیحیں اور استعارے غزل کے مروجہ ذخیرے سے ماخوذ ہیں۔ اس کے باوجود ان میں نیاپن ہے ۔ ؎

بھیڑ ایسی ہے کہ مجھ کو راستہ ملتا نہیں
گل کوئی کھلتا نہیں، شعلہ کوئی اُٹھتا نہیں
اے غرورِ حسن، میں تیرے بدن کا عکس ہوں
محو حیرت ہوں کہ تُو نے مجھ کو پہچانا نہیں

جمیل یوسف نے محبت کے جذبات کو اور محبوب سے اپنے تقاضوں کو بڑے نازک اور مشتاقانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی تعلق سے انہوں نے اپنے زمانے کو سمجھنا چاہا ہے اور خود اپنی ذات کو تلاش کیا ہے۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

مجھ پہ الزام نہ رکھا ہوتا
میری آنکھوں سے جو دیکھا ہوتا
تو بھی آوارہ و حیران پھرتا
میری مانند جو تنہا ہوتا
تیرا ثانی نہیں کوئی لیکن
کاش تو مجھ سا اکیلا ہوتا
میرے احساس کی ویرانی کو
کوئی تو دیکھنے والا ہوتا!

"موجِ صدا" کی غزلیں، اردو کے سرمایۂ سخن میں بیش قرار اضافہ نہ سہی لیکن حوصلہ افزا یقیناً نہیں اور ان کی روشنی میں ایک خوشگوار اضافے کی توقع بہرحال کی جا سکتی ہے۔

کتابت اور طباعت معیاری ہے۔ دبیز کاغذ پر اُسے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ جو ناشرین کی خوش ذوقی پر دال ہے۔

زلف و زنجیر

مصنف ۔ مسرور شکوہ آبادی
ناشر ۔ الیس ایم پبلیکیشنز دوکان نمبر ۲۷ بھایانی چیمبرز۔ شمالی ناظم آباد
صفحات ۶۴
قیمت درج نہیں۔

مسرور شکوہ آبادی کے مجموعۂ کلام "زلف و زنجیر" کے نام سے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ مجموعہ "کچھ غمِ جاناں اور کچھ غمِ دوراں" کی شعری تفسیر ہے۔ لیکن اس کی ورق گردانی کرنے سے اندازہ ہوا کہ اس کا بیشتر حصہ 'زلفِ محبوب' کے پیچوں کی نذر ہو گیا ہے۔ وہ اس کوچے میں نووارد معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے خیالات میں گہرائی اور پختگی یا اندازِ بیان میں رچاؤ کی توقع نہیں کی جا سکتی، نظموں اور غزلوں دونوں میں انہوں نے فرسودہ خیالات کو پٹی پٹائی تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کی مدد سے ظاہر کر دیا ہے۔ امید ہے کہ وقت گزرنے کیساتھ ساتھ جب ان کے خیالات میں زیادہ ٹھہراؤ آ جائے گا اور ان کا مطالعہ مزید وسیع ہو جائے گا تو وہ مزید مؤثر اور دل نشین پیرائے میں اپنے خیالات اور مشاہدات پیش کریں گے۔ چند اشعار بطور نمونہ حاضر خدمت ہیں۔

خونِ جگر سے جن کے نکھری بہارِ گلشن
بعد از خزاں چمن میں پھرتے ہیں مارے مارے
بریدہ شاخ، پژمردہ کلی، مغموم گُل بوٹے
عجب اب کے برس کچھ عالمِ بادِ بہاری ہے

کتابت آفسٹ پر سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ کتابت اگر بہتر ہوتی تو کتاب کے حسن میں اضافہ ہو جاتا۔

عہدِ ستم
(شاعری)

حبیب جالب۔
طابع و ناشر:۔ مکتبہ عوام ۴۸، چیمبرلین روڈ لاہور،
صفحات ۵۶۔ قیمت ۲ روپے

ایک غزل، ایک گیت، چند قطعات اور ۲۲، ۲۳ مختصر نظمیں، یہ ہے "عہدِ ستم" کا سرمایہ، ایک مختصر مجموعے میں اس سے زیادہ اور کیا آ سکتا ہے، لیکن نمائندہ شاعری کا وزن ترازو کے باٹ سے یا نظموں کے طول و عرض سے متعین نہیں ہوتا۔ حبیب جالب ہمارے زمانے کا نمائندہ شاعر ہے
نوا را تلخ ترمی کن جو ذوقِ نغمہ کمیابی'
کی مصداق جالب نے اس وقت آمریت کو للکارا جب ڈھکے چھپے استعاروں میں بات کرنا بھی خطرناک سمجھا جاتا تھا، جالب نے روائتی تکلفات بالائے طاق رکھے، طالب علموں، مزدوروں اور سیاسی کارکنوں کے روز و شب پر نظر ڈالی اور جو مظالم اُن پر توڑے جا رہے تھے، اُن کے خلاف اپنی شاعری کو احتجاج بنا کر پیش کیا۔ جو بات عام آدمی کے دل میں تھی اور جسے وہ زبان پہ لاتے ہوئے ڈرتا تھا، جالب نے اسی بات کو موضوعِ سخن بنایا۔

یہ تو ہوئی جالب کی انقلابی شاعری، لیکن یہاں ایک بات بہت اہم ہے۔ وہ یہ کہ حبیب جالب نے انقلابی شاعری کو ایک بالکل نیا آہنگ دیا ہے۔ جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی یہ ہے ان کے لہجے کی نغمگی اور دلسوزی، انہوں نے بند و سلاسل تیغ و تفنگ اور آگ و خون یعنی گھن گرج کے سارے لوازم دور رکھے اور انقلاب کے پیغام میں گیت کی نرمی اور غزل کی حلاوت حل کر دی، ہر مصرع کاغذ پہ گاتا گنگناتا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ نظمیں اگر تحت اللفظ ادا کی جائیں تو ان کا تاثر آدھا رہ جائے۔ غالباً اسی حلاوت اور نغمگی کا فیضان ہے کہ جالب کی غزلیں، انہی کے ترنم لہجے میں گنگنائی جانے لگیں اور ان کے دل کی بات رفتہ رفتہ ہزاروں لاکھوں دلوں میں بس گئی ؂

پھر توڑیں گے ہم زنجیریں، ہر لب کو آزاد کریں گے
جان پہ اپنی کھیل کے پھر ہم شہرِ وفا آباد کریں گے،
آخر کب تک چند گھرانے لوگوں پر بیداد کریں گے،

رشکِ بہاراں
(ناول)

از:۔ شور صہبائی
ناشر:۔ فیروز سنز لمیٹڈ
صفحات:۔ ۲۸۰۔ قیمت ۶٫۵۰ روپے

شور صہبائی صاحب لکھنؤ کے ایک ادب دوست خاندان کے فرد ہیں۔ ان کا تخلص، لکھنؤ کے شعری ماحول کا ورثہ ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ البتہ لکھنؤ کا دبستانِ نثر شاعری کے اثر سے آزاد نہ تھا بلکہ فنِ افسانہ پر بھی شعری رومانیت کی چھاپ بڑی گہری تھی۔ شور صاحب نے خود بھی یہ اثر قبول کیا اور ہر چند کہ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کی بنا پر انہوں نے زندگی کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کیا ہے۔ اور اپنے ماحول کی واقعاتی تصویر کشی کی کوشش بھی کی ہے، اس کے باوجود زیرِ نظر ناول، ادب کے رومانوی اثر سے پاک نہ رہ سکا۔ اس ناول کی ہیروئن ایک طوائف زادی ہے، جو مشرقی شرم و حیا کا مکمل نمونہ ہے،

شمع نے، جسے بازار میں ایک قابلِ فروخت مال کے طور پر سجا دیا گیا تھا، ابھی ابتدائی زندگی میں ہی معاشرے کے اُن کرداروں کا گہرا مطالعہ کر لیا تھا جو اپنی عزت اور عظمت کے باوصف طوائفوں سے رَبط و ضبط رکھتے تھے۔ لیکن نوجوان شاعر زلفی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ شمع اس کی ایثار پسندی اور شرافت کی دل سے قدر کرنے لگی اور بالآخر ایک حادثے نے ان دونوں کو بہت قریب کر دیا، البتہ شمع ایک طوائف زادی ہونے کی بنا پر خود کو زلفی جیسے نوجوان کی شریکِ زندگی بننے کی اہل نہیں سمجھتی تھی اور عین اس وقت جب کہ وہ اپنے انہی خیالات کا اظہار ایک خط میں کر کے رخصت ہونا چاہتی تھی۔ زلفی نے وہ خط پڑھ لیا اور شمع کو اپنی شریکِ حیات بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

طوائف کی روایتی شرافت اور عصمت، ہمارے ناول نگاروں کا پسندیدہ موضوع اور نظم گویوں کا دلپذیر عنوان رہی ہے، لیکن یہ باتیں، ترقی پسند تحریک کے ابتدائی عہد کی ہیں، جب جاگیر داری دَور کے ریاکارانہ اخلاق اور جھوٹی عصمت و عزت کا پردہ چاک کرنا ہی بڑا، ادبی کارنامہ شمار ہوتا تھا، جب حقیقت پسندی کا مفہوم کچھ اور متعین ہوا اور ادیبوں اور شاعروں نے اپنے ماحول کا مشاہدہ زیادہ قریب سے کیا تو معلوم یہ ہوا کہ طوائف زادی کو روایتی اخلاق و شرافت کی کسوٹی پر کس کر حیا و عصمت کی دیوی ثابت کر دکھانا بجائے خود اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارے ذہن ابھی قیدِ روایت سے آزاد نہیں ہو سکے اور خود ہمارے پیشِ نظر اخلاق و شرافت، عصمت و طہارت کا وہی معیار سب سے معتبر ہے جو ہمیں ایک زوال پذیر معاشرے سے ورثے میں ملا ہے۔ طوائف کو اس کے صحیح رُوپ میں سب سے پہلے منٹو نے پیش کیا اور اس کی "ننگِ انسانیت" تصویر اس طرح پیش کی کہ خود انسانیت ننگی ہو گئی، اور معلوم یہ ہوا کہ اپنی تمام تر کثافت اور بے عصمتی کے باوجود طوائف کی رُوح قابلِ احترام ہے البتہ قابلِ نفرت وہ نظام ہے جو انسانوں سے ان کی انسانیت چھین کر، اُن کے وجود میں رُوح کی تشنگی، بیزاری، جنس فروشی، چوری اور خباثت انڈیل دیتا ہے۔

بہرحال شور صہبائی نے زیرِ نظر ناول میں پوری نیک نیتی سے اپنے ماحول کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا پیرایہ بیان دلچسپ ہے۔ وہ قصہ بیان کرنے کا ڈھب جانتے ہیں، اور یہی اس ناول کی غالباً سب سے بڑی خوبی ہے۔

مکاشفات

مُصنّف:۔ مولانا حکیم انجم فوقی بدایونی
باہتمام:۔ فوق الادب۔ جی ۵۴۴۔ کورنگی کراچی
صفحات:۔ ۱۷۶۔ قیمت:۔ تین روپے

مکاشفات حکیم انجم فوقی صاحب بدایونی کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ یہ مکاتیب ان کے فلسفیانہ افکار پر مبنی ہیں، مختصر ہیں اور ادب کی چاشنی رکھتے ہیں۔ کتاب کے دیباچے سے معلوم ہوا کہ انجم صاحب کا ایک مجموعہ مکاتیب پہلے بھی شائع ہو چکا ہے، جسے علامہ نیاز فتح پوری مرحوم نے بیحد سراہا ہے۔ مُصنّف کا باضابطہ تعارف اگرچہ اس مجموعے میں موجود نہیں، تاہم خود اپنے بارے میں ان کے ارشادات ان کی شخصیت کو کسی قدر سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

"... میری نسل آدمی ہے۔ میری برادری انسان۔ رہے تمدنی اصطلاح میں کچھ خاندانی رشتے اور ان کے حقوق؟ تو اس معاملے میں خون سے زیادہ عمل کو ترجیح دیتا ہوں۔ اسلام میرا شعوری مذہب ہے اور بے لاگ خدمتِ خلق میرا نظریۂ عبادت!"

ان خطوط میں مذہب، معاشرت، اخلاق، عبادت کے موضوعات پر مختصر تبصرے اور بعض معاصر ادبا و شعرا کی شخصیت اور کلام پر ناقدانہ گفتگو ملتی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان خطوط کا راقم ایک دیندار، لیکن انسان دوست وسیع المشرب اور بے تعصب شخص ہے، شعر و ادب کا شائستہ ذوق رکھتا ہے۔ غور و فکر کا عادی ہے۔ روایت پرست ہے لیکن ماضی پرست نہیں،

یہ خطوط، جن لوگوں سے مخاطب ہو کر لکھے گئے ہیں، اگر کتاب میں کسی مقام پر ان کا بھی مختصر تعارف دے دیا جاتا تو بہتر تھا۔ بعض خطوط چند سطروں کے ہیں۔ لیکن ایک مشاق انشا پرداز کی قلم کاری اور مفکر کی اصابتِ فکر، ان میں بھی نمایاں ہے کتابت اور طباعت مناسب ہے۔

انتظامیہ گرانی کی روک تھام میں ناکام کیوں ہے؟

آیا تحصیل، ضلع اور ڈویژنوں کے افسروں یا گورنروں نے یہ خیال رکھا کہ قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور اضافے کو روکنے کی فی الفور سخت تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں؟ غذائی جنسوں کی قیمتوں کا روزانہ محاسبہ تو ان لوگوں کا کام تھا

غذائی جنسوں کی قیمتیں پچھلے دنوں جس پیمانے پر پہنچ گئیں، آیا انہیں ہمارے عوام کی آمدنیوں سے کوئی مناسبت ہے؟ کیا ہمارے کارفرماؤں نے ٹھنڈے دل سے کبھی غور کیا ہے کہ جن لوگوں کا گزارا دن بھر کی محنت مزدوری پر ہے یا جن کی تنخواہیں معمولی ہیں آیا وہ اپنے معمولی وسائل کی بنا پر یہ جنسیں خرید سکتے ہیں اور اپنے بال بچوں کے لئے قوت لایموت کا سامان بہم پہنچا سکتے ہیں؟ واضح رہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد شہری آبادی میں ستر فیصد سے کم نہ ہوگی۔

قطعاً شبہ نہیں کہ یہ گرانی ہمارے حریص اور لالچی کارخانہ داروں اور تاجروں نے دفتری حکومت کے کارفرماؤں سے مل کر پیدا کی ہوگی۔ اس میں ان کے پیش نظر کئی پہلو ہوں گے۔ مثلاً:-

۱- زیادہ روپیہ ملے گا پاکستان بننے کے بعد حرص زر ایک خوفناک وبا کی صورت میں ہمارے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔

۲- عوام میں سراسیمگی پیدا ہوگی اور ممکن ہے معاشی نظام میں بنیادی تغیر پیدا کرنے کی دعویدار جماعتیں پریشان ہو کر اپنے عزم سے دست بردار ہو جائیں اور لوٹ کھسوٹ کا دور بدستور قائم رہے۔

۳- ممکن ہے عوام کی بے چینی اور مصیبت زدگی ایسی شکل اختیار کرے کہ حالات کے ذمہ دار وہ لوگ قرار پائیں جو معاشی نظام کو بدل دینے کے بڑے بڑے دعوے کر رہے تھے۔ اس طرح پہلی حالت قائم رہے یا اس میں تبدیلی آبھی جائے تو وہ صرف جزوی اور سطحی ہو، بنیادی و اساسی نہ ہو۔

پاکستان میں ایسے لوگوں کے گروہ تو اسی وقت سے پیدا ہو گئے تھے، جب یہاں متروکہ جائدادوں کی تقسیم شروع ہوئی تھی اور اس تقسیم میں دینے والوں اور لینے والوں نے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا تھا۔ اسی وقت سے تاجر اور کارخانہ دار عوام کو اپنی حرص و آز کا تختہ مشق بنانے لگے۔ یہ لوگ دفتری حکومت کے کارکنوں سے حسب ضرورت ساز باز کر کے جو کچھ چاہتے تھے کر لیتے تھے۔ ان کا بنایا ہوا نقشہ ایسا زبردست تھا کہ پچھلے دنوں گوشت کی قیمتیں گھٹانے کے لئے جتنی کوششیں کی گئیں وہ بہت بری طرح ناکام رہیں۔ یوں مفسدوں اور فتنہ انگیزوں کو یقین ہو گیا کہ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اس خرابی کو دور کرنے کے لئے جو تدبیریں سوچی گئی ہیں۔ بالفعل یہ کہنا مشکل ہے کہ ان سے کیا نتیجہ نکلے گا لیکن پہلے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا تحصیل، ضلع اور ڈویژنوں کے افسروں یا گورنروں نے یہ خیال رکھا کہ قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور اضافے کو روکنے کے لئے فی الفور سخت تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں؟ غذائی جنسوں کی قیمتوں کا روزانہ محاسبہ تو ان لوگوں کا کام تھا۔

عوامی زندگی کا انہیں کوئی تجربہ نہیں

مصیبت یہ ہے کہ ان بڑے لوگوں کو عوامی سطح کی زندگی کا کبھی تجربہ نہیں ہوتا، لہٰذا ان میں بظاہر احساس باقی ہی نہیں رہا کہ عوامی ضرورت کی چیزوں کے نرخوں پر ہمیں کڑی نظر رکھنی چاہئے اگر کسی شے میں ذرا بھی بیشی ہو جائے تو متعلقہ لوگوں کو بلا کر سختی سے پوچھنا چاہئے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ضروری جنسوں کی قیمتوں اور عوام کے وسائل معاش کا موازنہ تو وہ لوگ بہ آسانی کر سکتے ہیں۔ انگریزی دور کی طرح ہمارے ہاں بھی وہ تمام سفید ہاتھی بدستور بندھے ہوئے ہیں۔ جن کا بظاہر کوئی کام نہیں۔ کاش وہ جنسوں کے نرخوں پر نظر رکھتے، عوام اور گورنر کے درمیان واسطہ بن کر وقت پر موثر قدم اٹھا سکتے۔ کاش گورنر نے مختلف حلقوں میں مختلف افسر مقرر کر دیئے ہوتے جو اُسے روزانہ کے حالات سے آگاہ کرتے رہتے۔ عوامی ضرورت کی تمام چیزیں خصوصاً غذائی جنسیں خاص توجہ کی محتاج ہیں۔ مگر ہمارے ہاں کسی کو بظاہر احساس ہی نہیں کہ اس سلسلے میں کتنا اہتمام ضروری ہے؟

حکومت کے مہیا کئے ہوئے محلوں میں رہ کر جھونپڑیوں کے حالات کا تصوّر کون کرتا ہے؟

سکندر لودھی کا حکم تھا کہ ہر شام کو تمام منڈیوں کے نرخ اس کے سامنے باقاعدہ پیش ہوتے رہیں تاکہ اسے وقت پر ضروری اقدام کا موقع حاصل رہے۔ چنانچہ اگر ایک بھی چیز کے نرخ میں اضافہ ہو جاتا تو وہ متعلقہ تنظیموں کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیتا۔ علاء الدین خلجی اپنی شاندار فتوحات کے باوجود ہمارے اچھے بادشاہوں میں شمار نہیں ہوتا۔ تاہم اس نے راشن بندی کا ایسا نظام تیار کر کے نافذ کر دیا تھا جس سے بہتر نظام آج تک جاری نہ ہو سکا۔ لطف یہ کہ اس میں کسی کے لئے کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ذرا سی بھی بے احتیاطی ہوتی تو بادشاہ کو اطلاع مل جاتی اور متعلقہ آدمیوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ لطف یہ کہ اس نے اپنے لئے بھی جنسوں کا کوئی ذخیرہ الگ نہیں کیا تھا۔ اس کے ملازم منڈی سے روزانہ جنسیں خرید کر لاتے۔ اس طرح بھی بادشاہ تمام حالات سے آگاہ رہتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جتنی اسلامی قدریں تھیں۔ انسانیت عالیہ کے اوصاف و محاسن کے جتنے اجزا تھے وہ تمام انگریزی عہد میں فراموش ہو گئے۔ ہمارے تمام کارکن انگریزی اداروں کے تربیت یافتہ ہیں۔ اپنی تاریخ سے انہیں زیادہ آگاہی نہیں۔ لہٰذا وہی کرتے ہیں جو انگریز کرتے تھے۔ یعنی بڑے بڑے بنگلوں میں رہنا۔ ہر قسم کے سامان آسائش سے فائدہ اٹھانا۔ عوام کو اپنی قوم کے اجزا نہیں بلکہ ایک الگ انبوہ تصور کرنا جن کی قسمت کی باگ قدرت نے ان کارکنوں کے حوالے کر دی۔ ان حالات میں حقیقی یگانگی کا احساس قائم ہی کیوں کر رہ سکتا ہے، جس میں انہیں محض انسان ہی نہیں بلکہ ایسے انسان سمجھا جائے جو کارکنوں کا لاینفک جزو ہیں یعنی جن کی خیر اندیشی اور بہی خواہی ان کارکنوں پر اپنے سے بڑھ کر لازم ہے بلکہ ان کی کارکردگی کا سب سے بڑا معیار ایک اور صرف ایک ہے اور وہ ہے عوام کی تکالیف کا بروقت احساس ہو اور ان کا جلد از جلد ازالہ کیا جائے۔ ہمارے ہاں یہ جوہر بالکل مفقود ہو گیا۔ کبھی کبھی ایسا اعلان ہم سن لیتے ہیں کہ سرکاری ملازم چھوٹوں یا بڑوں نے عوام کے خدمت گزار ہیں۔ مگر اس پر عمل کی نوبت کبھی نہیں آئی الا ماشاء اللہ۔

سرکاری ملازموں اور کارکنوں کی بے حسی اور غفلت، تاجروں، دکانداروں، کارخانہ داروں، آٹا پیسنے کی مشینوں کے مالکوں یا غلے کے بڑے بڑے ذخیرے پیدا کرنے والوں کا مقصد ایک اور صرف ایک ہے۔ زیادہ سے زیادہ روپیہ جلد از جلد سمیٹ لینا۔ وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ انتظامات کے ذمہ داروں کو وقت پر خبر ہی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ عملاً عوام کی سی زندگی بسر نہیں کرتے اور حکومت کے مہیا کئے ہوئے محلوں میں بیٹھ کر جھونپڑیوں کے حالات کا تصور کون کرتا ہے؟ جب تک سب کچھ ذمہ دار سرکاری افسر پر اسی طرح نہ گزرے جس طرح عوام پر گزرتی ہے۔ اصلاح کا حقیقی جذبہ کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے؟ آج پورے نظام میں بنیادی تغیر لازم ہے۔

بائیں بازو کی تحریک کے چند مسائل

علی امجد جعفری

علی امجد جعفری صاحب نے اپنے سابقہ مضمون (مطبوعہ لیل و نہار ۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء) میں عام انتخابات کے نتائج کا ایک تجزیہ پیش کیا تھا۔ زیر نظر مضمون میں انھوں نے اُن نکات کی نشاندہی کی ہے جو بائیں بازو کے عناصر کو اتحاد اور عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ ادارہ کا صاحب مضمون کے تمام خیالات سے اتفاق رائے ضروری نہیں

اشتراکی عناصر بنیادی حقوق کی جدوجہد کو آگے لے چلیں

عام انتخابات کے نتائج سے جہاں عوام کی بے چینی، سماجی تبدیلیوں کی آرزو اور معاشی ظلم و استحصال کے خاتمے کی تمنا کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس بات میں بھی کلام نہیں کہ اس کے نتیجے کے طور پر جمہوری اور عوامی طاقتوں کے منظم ہونے اور جدوجہد کرنے کے لئے زیادہ سازگار حالات بہم ہوئے ہیں۔ عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) کی انتخابی کامیابیوں نے ملک میں جو سیاسی فضا پیدا کی ہے اس میں ترقی پسند اور اشتراکی عناصر کے لئے زیادہ موثر کام کرنا ممکن ہے۔

مگر اس سے یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ اب ملک میں جاگیرداری اور اجارہ داری کے تسلط کو ختم کر دینا بہت آسان ہو جائے گا یا یہ کہ سامراجی ریشہ دوانیوں کی کامیابی کے اندیشے ختم ہو گئے ہیں۔ ملک کے بڑے حصے میں جاگیرداری قائم ہے بعض علاقوں میں ابھی بھی قرون وسطیٰ کی سی جاگیرداری کا نظام بدستور چلا آرہا ہے زمین پر بڑے وڈیروں اور زمین مالکوں کی اجارہ داری بجنسہٖ برقرار ہے اور ہماری صنعتوں پر کچھ سرمایہ دار گھرانوں نے اپنی جاگیریں قائم کر رکھی ہیں۔ پرانے نظام میں تبدیلی لانے کی تمام کوششوں کو ان طبقات کی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا اور اقتصادی تبدیلیوں کے لئے ہر قدم پر اُن سے لڑنا پڑے گا۔ اس لئے جاگیرداری اور اجارہ داری کے تسلط کو ختم کرنے کی جدوجہد در اصل ابھی شروع ہوئی ہے۔

آنے والے دنوں کی اس جدوجہد میں دو بڑی دشواریوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ پہلی دشواری تو خیر اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ اشتراکی عناصر جو نظریاتی طور پر اس جدوجہد کی صفِ اوّل میں ہیں وہ اس بری طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کی کارکردگی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی ہے۔ مگر اس مسئلہ کی طرف بعد میں رجوع کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔

دوسری دشواری یہ ہے کہ عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) جن پر عوام نے ان تبدیلیوں کے لئے اعتماد کیا ہے اور جن پر یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ وہ تینوں کسی نہ کسی حد تک ان ہی استحصالی طبقوں کی آماجگاہ بن گئی ہیں یا ان کے لئے ان طبقوں کی آماجگاہ بن جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ پیپلز پارٹی کے اندر اور باہر اشتراکی عناصر اس بات سے بہت پریشان ہیں کہ سندھ میں خصوصاً اور پنجاب میں بھی اس پارٹی کی قیادت میں جو لوگ اُبھرے ہیں اور جو لوگ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں کامیاب ہو کر گئے ہیں ان کی بڑی تعداد ایسی ہے جو نہ صرف خود خاصے بڑے وڈیرے اور جاگیردار ہیں بلکہ جن کا فکری اور ذہنی لگاؤ بھی سوشلزم کے اس پروگرام سے نہیں ہے جس کی داعی بن کر پیپلز پارٹی انتخابات میں کامیاب ہوئی ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی میں بھی کم از کم صوبہ سرحد میں ایسے عناصر شریک ہو کر اہم مقامات پر پہنچ گئے ہیں جن سے یہ اُمید رکھنا کہ وہ کسی انقلابی تبدیلیوں کے پروگرام کو عمل میں لائیں گے خود فریبی کے مترادف ہوگا۔ عوامی لیگ کے کردار پر انتخابات کے نتائج کا کیا مزید اثر پڑا ہے اس کا علم نہیں ہے۔ مگر عام طور سے ایسے حالات میں اور ایسی جماعتوں میں ہوتا یہی ہے کہ انتخابات کے بعد کامیاب جماعتوں پر مفاد پرستوں کی ایسی یورش ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھے لوگوں کیلئے اپنا دامن پاک رکھنا مشکل کام ہو جاتا ہے۔

اس لئے یہ ظاہر ہے کہ حکومتوں کی تشکیل کے بعد ان جماعتوں میں خود ان کے پروگراموں کو عملی شکل دینے پر سخت کشمکش اور جدوجہد ہونے والی ہے۔ اشتراکی اور آزاد خیال عناصر عوامی پروگراموں پر عمل پیرا ہونے کے لئے زور لگائیں گے اور پرانے، دقیانوسی اور رجعت پرست عناصر اپنا سارا زور اس بات پر صرف کریں گے کہ پروگراموں کی بات "زیب طاق نسیاں" بن جائے۔ اس میں کون کامیاب ہوگا اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ عوامی تحریک کتنی باشعور اور منظم طریقے پر چلتی ہے اور جاگیردار اور اجارہ دار مخالف پروگراموں پر عمل پیرا ہونے کے لئے عوامی تحریکیں کتنی وسیع اور طاقتور بن پاتی ہے۔

جمہوری دستور کے مسائل

حکومت بننے کے مرحلے سے پہلے خود دستور سازی کا مسئلہ ہے۔ آج دستور سازی کا سارا مسئلہ محض صوبائی خودمختاری کی وسعت اور مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ دستور سازی کے اس پہلو کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں مگر اس کے دوسرے پہلوؤں کو بالکل ہی فراموش و نظر انداز کرنا غلط ہوگا۔ مثال کے طور پر "بنیادی حقوق" کا مسئلہ کسی بھی جمہوری دستور کے لئے بہت اہم ہے۔ خاص کر اس حالت میں کہ ہم عوام سے اپنے کئے ہوئے ان وعدوں کے پابند ہیں اور معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ میں بنیادی تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ اس لئے بنیادی حقوق کی دفعات میں اگر ایک طرف آزادیٔ رائے، آزادیٔ تنظیم اور ہڑتال کے حقوق کو جگہ ملنی چاہئے تو دوسری طرف ذاتی ملکیت کے حق پر اس قدر پابندی لگانا ضروری ہے تاکہ جاگیرداری اور اجارہ داری کے خاتمہ کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس بات کی قطعی ضرورت ہے کہ حکومت کے ہاتھوں میں یہ اختیارات نہ ہوں کہ وہ جس کو چاہے امتناعی نظربندی کے ماتحت گرفتار کرلے۔ یہ چند باتیں محض مثال کے طور پر کی گئی ہیں۔ ورنہ "بنیادی حقوق" اور جمہوری دستور کا مسئلہ ایک تفصیلی بحث اور کئی مضامین کا محتاج ہے۔

اگر اگلے دو ماہ کے اندر بائیں بازو کے اشتراکی عناصر ایسے "بنیادی حقوق" کی مہم کھڑی کر سکیں جسے دستور میں نافذ کر کے محنت کش عوام کے حقوق کا بہترین تحفظ کیا جاسکتا ہے اور سماجی تبدیلیوں کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے، تو یہ انتخابات کے بعد ترقی پسند طاقتوں کو اکٹھا کرنے اور تحریک کو آگے

لے جانے کا ایک موثر قدم بن سکتا ہے۔

اسی طرح زرعی اصلاحات اور تبدیلیوں کا مسئلہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ موثر زرعی اصلاحات اور ہاریوں اور کسانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایسی تجاویز مرتب کی جائیں جن کے حصول کے لئے دیہاتی آبادی کے بڑے حصے کو متحد اور متحرک کیا جا سکے اور اُن کو قانونی شکل دینے کیلئے عوامی تحریکیں کھڑی کی جا سکیں مزدوروں کے تنظیم کے حقوق، مزدور قوانین میں مناسب تبدیلیوں اور اسی طرح کے دیگر مسائل۔ "یونیورسٹی آرڈی ننس" تعلیمی پالیسی وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن پر عوام کے مطالبات کو گوشت پوست عطا کر کے عوامی تحریک کا دوسرا قدم اُٹھایا جا سکتا ہے۔

ایسی حالت میں جبکہ عوامی تمناؤں اور خواہشات کو ٹھوس شکل دے کر ایک جمہوری دستور کی تشکیل کی جدوجہد تیز اور اس کے لئے مختلف الخیال بائیں بازو اور اشتراکی عناصر کو عملی طور پر یکجا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے بہت سے دوست اپنا سارا زور یہ ثابت کرنے میں صرف کر رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ کی سوشلزم جعلی اور فرضی ہے اور انتخابات میں ان کی کامیابی کو اشتراکیت کی کامیابی بتانا ایک بین الاقوامی سازش ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ "ان جماعتوں کی متوقع ناکامیوں کو اشتراکیت کی ناکامی بتا کر اصلی سوشلزم کو بدنام کیا جا سکے۔"

آزمائش کا وقت اب آ رہا ہے۔

ہمارے یہ دوست یہ سمجھنے میں ناکام ہیں کہ یہ جماعتیں اشتراکیت کے عام فلاحی نعروں کی بنا پر کامیاب ہوئی ہیں اور انکی آزمائش کا وقت اب آ رہا ہے۔ عوام ان جماعتوں کے وعدوں کی کڑی آزمائش قرار واقعی طور پر کرنے والے ہیں مگر اشتراکی عناصر کو ایسی تحریکوں کی داغ بیل ڈالنی ہے جس کے ذریعہ ان تمام جماعتوں اور ان کے کئے ہوئے وعدوں کی آزمائش کی جا سکے۔ اس سے پہلے یہ اعلان کر دینا کہ یہ جماعتیں اپنے وعدوں کو پورا نہیں کریں گی شاید ہمارے ان دوستوں کے ضمیر کو مطمئن کر دے کہ انہوں نے اپنا کام پورا کر دیا چاہے عوام ان کی باتوں کو مانیں یا نہ مانیں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس طرح کے اعلانات سے سماجی انصاف اور تبدیلیوں کی کوئی عوامی تحریک نہیں کھڑی ہو سکتی۔ جمہوری دستور کی جدوجہد کے لئے ان تمام لوگوں کو ساتھ لینا ضروری ہے جو آج مختلف جمہوری جماعتوں میں منقسم ہیں۔ ان لوگوں کو بھی ساتھ لینا ضروری ہے جو پیپلز پارٹی، عوامی لیگ یا نیپ (ولی گروپ) سے آس لگائے بیٹھے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جنہیں اپنے سوا کسی سے کوئی اُمید نہیں ہے۔ اور اس عظیم تر متحدہ تحریک کی ابتدا کبھی ان بُنیادوں پر کھڑی نہیں کی جا سکتی جو یکسر منفی ہوں اور جس کی بُنیاد مذمت اور طعن و ملامت کے سوا کچھ نہ ہو۔

سب سے بڑی مصیبت۔ جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ یہ ہے کہ اپنے کو بائیں بازو کہنے والے ہر دس آدمیوں کے گروہ کا دعویٰ ہے کہ ان کے اختلافات بنیادی اور نظریاتی ہیں" اور بنیادی اختلافات کو حل کئے بغیر بائیں بازو کے اتحاد کی گفتگو کرنی موقع پرستی ہے" حسن ناصر ڈے کے موقعہ پر عبدالحفیظ پیرزادہ نے ایک بات کہی تھی بائیں بازو کا اتحاد، دائیں بازو کے اتحاد کے مقابلہ میں زیادہ مشکل ہے چونکہ ہمارے اختلافات اصولی ہیں مگر ایک بار اتحاد ہو جانے کے بعد بائیں بازو کا اتحاد زیادہ پائدار ہوتا ہے چونکہ یہ اتحاد بھی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے"

اتحادِ عمل کا راستہ

بات خوبصورت تھی اس لئے تالیاں بہت ملی تھیں مگر بائیں بازو کی خودستائی کے سوا اس فقرے میں سچائی کی تلخی نہیں ہے۔ اور سچائی یہ ہے کہ بائیں بازو کے مختلف اشتراکی عناصر کے اختلافات اوّل تو اپنے ملک میں کبھی واضح طور پر بیان نہیں کئے گئے اور دوم یہ کہ ان میں سے اکثر و بیشتر اختلافات اصولی سے زیادہ فروعی ہیں جن کا تعلق عوامی تحریک کے نظری تقاضوں سے نہیں، سوم یہ کہ ان اختلافات کو عوامی تحریک کے درمیان اختلافات سمجھ کر ماؤزے تنگ کی جدلیاتی اصطلاح میں عوام کے باہمی تضادات سمجھ کر حل کرنے اور دور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے آج اس بات کی ضرورت ہے کہ عوامی تحریکوں کے سلسلہ میں اشتراکی عناصر اپنی اپنی پوزیشن واضح کریں۔ اگر اختلافات ہیں تو انہیں بیان کریں اور ان مشترک پہلوؤں کو کھوج نکالیں جن کی بنا پر جمہوریت اور اشتراکیت کی جدوجہد کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

اتفاق کچھ ایسا ہے کہ ملک کی اکثر و بیشتر عوامی جماعتوں میں بائیں بازو کے اشتراکی عناصر خاصی تعداد میں موجود اور سرگرم ہیں یہ اشتراکی عناصر اگر اپنی محدود و تنگ نظری کے شکار نہ ہو جائیں تو ان مختلف عوامی جماعتوں کے اشتراکِ عمل کی راہیں ہموار کر سکتے ہیں اور خود ان کا باہمی اشتراک ان جماعتوں کو زیادہ بامعنی اور بامقصد عوامی جمہوری کردار ادا کر سکتا ہے اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ ملک کی موجودہ صورت حال میں عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) تینوں کا عوامی اور جمہوری کردار ہے، البتہ ان میں سے کسی کا کردار، خالص اور سائنٹفک سوشلسٹ کردار نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے کردار پر الیکشن کے تقاضے اثر انداز ہوئے ہیں اور ہر ایک پر مفاد پرست ٹولی کی یورش ہے تاکہ وہ کرسی اقتدار پر براجمان ہو سکے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ان تینوں جماعتوں میں اشتراکی عناصر بھی موجود ہیں اور یہ جماعتیں بہرحال اپنے اپنے حلقے میں عوام کے جذبات اور احساسات کی۔ جو مختلف جذبات اور احساسات ہیں، نمائندہ بن کر اُبھری ہیں جمہوری دستور کی جدوجہد نے ابھی تک کوئی ٹھوس شکل اختیار نہیں کی ہے۔ مگر اس سب سے اہم سیاسی جدوجہد کو ایک تحریک کی شکل دینا ان جماعتوں میں سرگرم اشتراکی عناصر کا کام ہے اور اس جدوجہد میں ان کا اشتراک عوامی تحریک کی مزید ترقی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

میں نے نیپ (بھاشانی گروپ) کا تذکرہ اس بنا پر نہیں کیا کہ مغربی پاکستان میں اس کا شیرازہ بکھرتا ہوا نظر آتا ہے اور مشرقی پاکستان میں اس کا کردار کچھ اس قدر تیزی سے بدل رہا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔

جملہ معترضہ کے طور ایک آخری بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں یہ غلطی ہمارے یہاں کے اشتراکی عناصر میں کافی عام ہے کہ "اقتصادی عوامل اور صرف اقتصادی عوامل ہی عوام کے شعور میں تبدیلی کی بنیاد ہوتے ہیں" اسی غلطی کی وجہ سے ہمارے اکثر اشتراکی دوست انتخابات کے بعد کے دنوں میں صرف یا زیادہ تر محض اقتصادی مسائل پر اپنی توجہ صرف کر رہے ہیں۔ جب کہ ضرورت محنت کش عوام کے دستوری اور سیاسی مطالبات مرتب کرنے اور ان کے حصول کے لئے ٹھوس تحریک منظم کرنے کی تھی مہنگائی کے خلاف مظاہرے درست، پی پی ایل کے صحافیوں کی جدوجہد بھی جائز اور کارخانے کے مزدوروں کی اقتصادی لڑائیاں بھی برحق مگر یہ تمام جدوجہد محنت کش عوام کی اس جدوجہد کی جگہ نہیں لے سکتی ہے جو اسے سیاسی سطح پر ایک جمہوری دستور کی تشکیل کے لئے کرنی ہے اور جس کے بغیر محنت کش اور مزدور طبقہ جمہوری انقلاب میں اپنا رہنما کردار نہیں ادا کر سکتا۔

اقتصادی عوامل اور عوامی شعور کے درمیان جو تعلق ہے اس کی بحث شاید کبھی آئندہ ہو سکے مگر ان کا تعلق اتنا سیدھا سادھا نہیں جتنا ہمارے بہت سے دوست سمجھتے ہیں، ورنہ بیس اور تیس برسوں سے عوام اور مزدور طبقے کے درمیان اقتصادی جدوجہد کرنے والے ہمارے ٹریڈ یونین رہنماؤں کا حال انتخابات میں اتنا خراب نہ ہوتا جتنا ہمیں لاہور سے حیدرآباد اور کراچی تک نظر آتا ہے۔

ڈھاکہ سے ایک خط : احمد الیاس

بائیں بازو کی جماعتیں بھاشانی کے ایک نکاتی نعرے کا مقابلہ کریں گی

صدر یحییٰ اور شیخ مجیب آئین کے چھ نکاتی فارمولے پر متفق ہو گئے

بنگالیو! ہتھیار اٹھاؤ اور پوربو بنگلہ کو آزاد کراؤ انتہا پسند طلبا کا نعرہ

پاکستان کے اتحاد کی ایک ہی صورت ہے قومی جمہوری انقلاب

گذشتہ دو ہفتے کے دوران میں مشرقی پاکستان کی سیاست میں بڑی زبردست تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ "مستقبل کے وزیر اعظم" کے ساتھ صدر مملکت کے مذاکرات سنتوش کی "قومی کانفرنس" بھاشانی نیپ سے حاجی دانش کی علیحدگی اور ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹس لیگ کے اندر نظریاتی ٹکراؤ چند ایسے اہم واقعات ہیں جن کا سیاسی مبصرین گہری نظر سے جائزہ لے رہے ہیں۔

شیخ مجیب الرحمٰن اور صدر یحییٰ خاں کے درمیان دو روزہ اہم گفت و شنید کے بعد ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر صدر کا یہ کہنا کہ شیخ مجیب الرحمٰن مستقبل کے وزیر اعظم ہیں" کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے۔ کیونکہ اکثریتی پارٹی کے اعتبار سے اس ملک میں اگر کوئی سیاسی جماعت اقتدار سنبھال سکتی ہے تو وہ صرف عوامی لیگ ہے اور پارٹی لیڈر کی حیثیت سے عوامی لیگ کے سربراہ ہی مستقبل کے وزیر اعظم بن سکتے ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں جو اہم بات ہو سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اسی وقت ملک کے وزیر اعظم ہو سکتے ہیں جب دستور مرتب ہو جائے اور اس دستور پر صدر یحییٰ اپنا دستخط کر دیں۔ اس لحاظ سے صدر اور شیخ مجیب کے درمیان ہونے والی گفت و شنید کے بارے یہ محتاط رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ عوامی لیگ کے سربراہ صدر سے اپنے مذاکرات کے دوران کوئی ایسا فارمولا دریافت کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں جو "آئینی ڈھانچے" کی موجودگی میں ان کے "چھ نکات" کی بنیادوں پر مرتب ہونے والے دستور کی راہ میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

دوسرے معنوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ مجیب نے صدر کے آئینی ڈھانچے کی روشنی میں دستور مرتب کرنے پر اپنی پارٹی کی طرف سے رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ ان حالات میں یہ قیاس کرنا غلط نہ ہو گا کہ ملک کا آئندہ دستور ۱۲۰ دن کی مقررہ مدت سے کم عرصے میں مرتب ہو جائے گا اور صدر یحییٰ کے لئے اس پر دستخط کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہو گا۔ اور اگر یہ خیال غلط ہے۔ تو پھر ہمیں دستور کی تیاری اور اس کی منظوری سے قبل صدر مملکت کی طرف سے ملک کی اکثریتی پارٹی کے سربراہ سے متعلق "مستقبل کے وزیر اعظم" کے الفاظ استعمال کئے جانے کے بارے میں کوئی اور جواز تلاش کرنا ہو گا۔ جو فی الحال ہمارے لئے مشکل ہے۔

سنتوش "قومی کانفرنس" کے بعد

مشرقی پاکستان کا دوسرا اہم واقعہ سنتوش میں ہونیوالی "قومی کانفرنس" ہے۔ بادی النظر میں یہ "قومی کانفرنس" چند مایوس سیاستدانوں کی اپنی "سیاسی بقا" کی جدوجہد معلوم ہوتی ہے اور اس بارے میں ہم لیل و نہار کے گذشتہ شمارے میں یہ بتا چکے ہیں کہ مولانا بھاشانی اپنی عمر کے آخری حصے میں نیشنل عوامی پارٹی کی ٹوٹتی اور بکھرتی ہوئی قوت کو یکجا کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ ہم یہاں ایک اہم نقطے کو نظر انداز نہیں کر سکتے اور وہ یہ کہ مولانا بھاشانی نے عوامی لیگ کے چھ نکات سے آگے بڑھ کر "ایک نکتے" کا جو نعرہ بلند کیا ہے اور جس طرح وہ انتہا پسند بنگالی قومیت کی لہروں میں بہہ رہے ہیں اس کی آخری منزل کیا ہے؟ سنتوش میں انہوں نے جس طرح مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان لکیر کھینچی ہے وہ اس وقت غیر واضح معلوم ہوتی ہے۔ لیکن صوبے کی موجودہ سیاسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس کی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ مستقبل میں مولانا بھاشانی کی ایک نکاتی پالیسی کوئی گل نہیں کھلائے گی۔ مولانا صاحب ماضی میں بائیں بازو کے قائد تھے۔ بلاشبہ انہوں نے یہاں کی ترقی پسند قوتوں کو اپنی انقلابی سرگرمیوں سے تقویت پہنچائی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے بائیں بازو کو خاصا نقصان بھی پہنچایا اور بالآخر اپنی "آمرانہ" روش اور بے سروپا تقریروں سے نیشنل عوامی پارٹی کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کر دیا جہاں سے ان کے دیرینہ رفیقوں اور ساتھیوں نے علیحدگی کے راستے اختیار کئے۔ سنتوش قومی کانفرنس سے ایک روز قبل مولانا بھاشانی کے سب سے پرانے ساتھی اور مشرقی پاکستان کے معمر انقلابی سیاستدان حاجی دانش نے مولانا بھاشانی کے نام ایک کھلے خط میں یہ الزام لگایا کہ۔

"آپ نے ۱۹۵۸ء کے ستمبر میں فروری ۱۹۵۹ء کے مجوزہ انتخابات کے بارے میں یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ انتخابات نہیں ہوں گے۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں کراچی سے واپس آنے کے بعد آپ نے یہ کہا تھا کہ مارشل لا آنے والا ہے۔ آپ کو یہ یقین تھا کہ اسکندر مرزا اور ایوب خاں سوشلزم لائیں گے۔ ایوب خاں کے خلاف بائیں بازو کے اتحاد کے بارے میں آپ کے رویے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس حکمران طاقت کے ساتھ آپ کا گٹھ جوڑ تھا جو ہمارے ملک کے استحصالی قوتوں کی نمائندہ تھی۔"

اسی خط میں حاجی دانش نے یہ حقیقت پسندانہ باتیں بھی کہیں کہ۔

"سامراج، جاگیرداری اور اجارہ دار سرمایہ داری نے ملک کے دونوں بازوؤں کے مظلوم عوام کا یکساں استحصال کیا ہے۔ ان عوام دشمن طاقتوں کو شکست دینا بہت آسان ہے بشرطیکہ ملک کے دونوں بازو کے مظلوم عوام متحد ہو کر اس کے خلاف جدوجہد کریں۔"

بائیں بازو کے عناصر کو الگ کرنے کی کوشش

حاجی دانش کا یہ خط ۸ جنوری کو منظر عام پر آیا اور اس خط میں حاجی دانش نے نیپ سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا۔ اس سے ایک روز قبل یعنی ۷ جنوری کو مشرقی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے آٹھ لیڈروں کا ایک مشترکہ بیان اخباروں میں شائع ہوا جس

میں نیپ کی بجائے مولانا بھاشانی کی قیادت سے الگ تھلگ رہنے کا اعلان کیا گیا۔ ان آٹھ لیڈروں میں پارٹی کے دونوں جوائنٹ سکریٹری نورالہدیٰ، قادر بخش اور انورزاہد کے علاوہ ڈھاکہ سٹی نیپ کے سکریٹری محمد سلطان، نائب صدر قمرالاسلام اور ورکنگ کمیٹی کے ارکان شامل تھے۔ ان آٹھ لیڈروں نے مولانا بھاشانی پر یہ الزام لگایا کہ ۸ جنوری کو انہوں نے سنتوش میں جو مندوبین کانفرنس طلب کی ہے وہ بھی ان کا "ایک اور" غیر جمہوری اقدام ہے۔ اس کے بعد نیپ کے چار کونسلروں کی طرف سے ایک مشترکہ بیان اخباروں میں شائع ہوا جس میں مولانا بھاشانی کی قیادت پر سخت اعتراضات کئے گئے اور ان کی تحریک سے علیحدگی کا اعلان کیا گیا۔

سنتوش قومی کانفرنس سے قبل نیشنل عوامی پارٹی کی ڈھاکہ سٹی کمیٹی توڑ دی گئی اور اس کی جگہ پرانی کمیٹی کے صدر جناب عبدالجلیل کی سربراہی میں ایک ایڈہاک کمیٹی قائم کر دی گئی۔ یہ دراصل مولانا بھاشانی کی نئی مہم کی ایک کڑی تھی جس کے تحت وہ اپنی پارٹی سے بائیں بازو کے عناصر کو الگ کرنا چاہتے تھے۔ اس مہم کے تحت انہوں نے سٹی کمیٹی سے زاہد اور چھوٹی گروپ کے حامیوں کے ساتھ ساتھ حق طہ گروپ کے عبدالرشید، محمد خالد، سید جعفر اور عبدالرؤف کو علاؤالدین، مینن گروپ کے عبدالصمد، ظہورالاسلام کو اور جعفر۔ میس گروپ کے کمال لوہانی اور کمال حیدر کو الگ کر دیا۔ یہی حال صوبے کی ان چھ کمیٹیوں کا ہوا جو ایک ماہ کے دوران توڑ دی گئیں۔

مسیح الرحمان گروپ، عبدالحق گروپ

بائیں بازو کے ان عناصر کو پارٹی سے الگ کرنے کے بعد مولانا بھاشانی کے ساتھ اب جو موقع پرست عناصر رہ گئے ہیں وہ بھی دو گروپ میں منقسم ہیں جن میں سے ایک کی قیادت تو مسیح الرحمٰن کر رہے ہیں اور دوسرے کی بیرسٹر عبدالحق۔ اس پس منظر میں مولانا بھاشانی کی قومی کانفرنس نے ایک نکتے کا نعرہ بلند کیا ہے جس کا مقصد مشرقی پاکستان کو لاہور کی قرارداد کے مطابق آزاد اور خود مختار ریاست بنانا ہے۔ مولانا کے اس مطالبے کی حمایت کرنے والوں میں عطاء الرحمٰن، ایس ایم سلیمان اور پیر محسن الدین شامل ہیں۔ لیکن ان میں بھی عطاء الرحمٰن صاحب کی حالت یہ ہے کہ ان کی پارٹی کے ایک گروپ نے انہیں مجلس عاملہ سے نکال دیا ہے۔ اس گروپ کی قیادت ولی عہد کر رہے ہیں جن کے بارے میں یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ اگر حاجی دانش نے کوئی الگ سیاسی جماعت بنائی تو یہ اس کا ساتھ دیں گے۔ ایس ایم سلیمان نے قومی کانفرنس کے مطالبے کو اپنے کونسلروں کے اجلاس میں منظوری کے لئے پیش کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اور پیر محسن الدین کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ ان کی سیاسی جماعت جمعیت العلمائے اسلام (ہزاروی گروپ) صرف اُن کی ذات تک محدود ہے۔

ان حالات میں ہم یہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا بھاشانی کی اس نئی تحریک نے مشرقی پاکستان میں انہیں بائیں بازو سے کاٹ کر موقع پرستوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ اور اب وہ اپنی تمام تر "سوشلزم" کے باوجود طبقاتی جنگ کے محاذ سے اُٹھ کر علاقائی جنگ کے مورچے میں آ بیٹھے ہیں جہاں سے وہ "مغربی پاکستان کے مال کا بائیکاٹ کرو" اور "بنگالی قوم کو سیاسی آزادی دو" کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ مولانا اپنی اس جنگ میں کہاں تک کامیاب ہوں گے یہ ایک الگ بحث ہے لیکن، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے یہ نکتہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ "اُن کی آخری منزل کیا ہے؟" ہمیں اس وقت حالات کا سنجیدگی سے تجزیہ کرنا ہوگا۔

منظفر احمد، نیپ کی قیادت سے جلد ہی الگ ہو جائیں گے

مولانا بھاشانی کٹر قوم پرست ضرور ہیں مگر علیحدگی پسند نہیں۔ لیکن نیشنل عوامی پارٹی کی "سیاست" سے الگ ہٹ کر اب وہ جس راہ پر آج چل رہے ہیں وہ بلاشبہ قومی یکجہتی کی راہ نہیں ہے۔ کیونکہ مولانا نے اپنی اور اپنے "نو وارد ساتھیوں" کی سیاسی بقا کے لئے انتہا پسند بنگالی قومیت کا جو نعرہ بلند کیا ہے اُس سے بالآخر علیحدگی پسندوں کو ہی فائدہ پہنچے گا ٹھیک اُسی طرح جیسے حالیہ قومی انتخابات سے قبل اُن کے چند مخصوص نعروں نے صوبے میں عوامی لیگ کی "بے مثال" کامیابی کی راہ متعین کی تھی۔ اور جس کا اعتراف خود مولانا بھاشانی نے بھی کیا ہے کہ عوامی لیگ کی اس کامیابی کے پس پردہ چھ نکات کو دخل نہیں ہے بلکہ بنگالی عوام نے عوامی لیگ کو اس لئے کامیاب بنایا ہے کہ وہ قرارداد لاہور کے مطابق آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

اس صورتِ حال کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ صوبے میں عوامی لیگ کی زبردست کامیابی کے بعد اسمبلی میں حزبِ اختلاف کا تصوّر ختم ہو چکا ہے۔ اب برسرِ اقتدار جماعت عوامی لیگ کے خلاف اگر حزبِ اختلاف قائم بھی ہوگی تو وہ اسمبلی کے باہر ہوگی۔ دائیں بازو کی جماعتیں مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی کامیابی کے بعد جس طرح چھ نکات کی حامی بن گئی ہیں اُس کے پیشِ نظر مشرقی پاکستان میں اِن جماعتوں کی طرف سے عوامی لیگ کے مقابلے میں حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرنا مُشکل ہے۔

دوسری بات یہ کہ دائیں بازو کی اِن جماعتوں کا اب مشرقی پاکستان میں کوئی سیاسی اثر باقی نہیں رہا۔ اس لحاظ سے مشرقی بازو میں صرف نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ اور ولی گروپ دو ایسی جماعتیں تھیں جو اسمبلی کے باہر عوام کی نمائندگی کر سکتی تھیں۔ بھاشانی گروپ بحیثیت سیاسی جماعت اب ختم ہو چکی ہے۔

نیشنل عوامی پارٹی ولی گروپ میں نظریاتی انتشار اتنا شدید نہیں ہے، لیکن اس کی مرکزی مجلسِ عاملہ کے حالیہ اجلاس میں پروفیسر منظفر احمد کی قیادت پر سخت تنقید ہوئی، لہذا قیاس کیا جاتا ہے کہ منظفر احمد صاحب نیپ کی قیادت سے جلد ہی الگ ہو جائیں گے اور ان کی جگہ نئی نسل کی قیادت اُبھرے گی۔ اِس خیال کو اِس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ حال ہی میں صوبے کے مختلف کالجوں میں جو انتخابات ہوئے ہیں ان میں سے بوگرہ، دیناج پور اور سلہٹ کے کئی کالجوں میں ولی نواز طلبہ یونین (مطیعہ چودھری گروپ) نے عوامی لیگ کی حامی طلبہ تنظیم چھاترو لیگ کو زبردست شکست دی ہے۔ ایسی صورت میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ نئی نسل کو اب بھی بائیں بازو پر اعتماد ہے اور اگر بائیں بازو کی جماعتیں اپنے نظریاتی اختلافات کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئیں تو وہ اسمبلی کے باہر ایک مضبوط حزبِ اختلاف کا کردار ادا کر سکیں گی لیکن اس کے لئے انہیں عوامی لیگ کی "حکمراں قوت" کے ساتھ ساتھ مولانا بھاشانی کے ایک نکاتی نعرے کا بھی مقابلہ کرنا ہوگا کیونکہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس نعرے کی حمایت خود عوامی لیگ کے حامی اُس حلقے سے کی جائے گی جو کٹر قوم پرست ہے اور جو آج بھی عوامی لیگ کے اندر حزبِ اختلاف کا دَرجہ رکھتے ہیں اور جس کا پہلا مظاہرہ عوامی لیگ کی حامی طلبہ تنظیم چھاترو لیگ کی ۲۳ویں سالگرہ کے موقع پر کیا جا چکا ہے جس میں خود شیخ مجیب الرحمٰن بھی موجود تھے۔ اس تقریب میں طلبہ کے ایک گروہ نے یہ نعرہ لگایا تھا کہ "بنگالیو! ہتھیار اُٹھاؤ اور پوربو بنگلہ کو آزاد کراؤ" شیخ مجیب کو "جے بنگلہ" کے ساتھ اب "جے پاکستان" کا نعرہ بھی لگاتے ہیں اس تقریب میں یہ اعلان کرنا پڑا تھا کہ "اگر انقلاب کی ضرورت در پیش آئی تو میں خود انقلاب کا نعرہ لگاؤں گا"۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "انتہا پسند انقلابی نعروں سے کسی مُلک میں انقلاب نہیں آتا اس کیلئے ایک مثبت پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے"۔

شیخ صاحب کا "مثبت پروگرام"

شیخ مجیب الرحمٰن کے نزدیک "مثبت پروگرام" کیا ہے یہ تو ہم نہیں جانتے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ان کی قیادت کے سائے میں پروان چڑھنے والی نئی نسل جو بنگالی قومیت کے جذبے سے سرشار ہے آج نہیں تو کل مولانا بھاشانی کے انتہا پسند بنگالی قومیت کے نعرے سے ضرور متاثر ہوگی اور یہ وقت ملک کی قومی یکجہتی کے لئے یقیناً بڑا نازک ہوگا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ مغربی پاکستان میں بائیں بازو کی جماعتیں پاکستان کے تمام صوبوں کے عوام کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی آزادی کے لئے اپنی جدوجہد کو تیز کریں اور مغربی پاکستان میں قومی جمہوری انقلاب کے لئے راہ ہموار کریں کیونکہ یہی ایک صورت ہے جو پاکستان کو "ایک پاکستان" کی حیثیت سے قائم رکھ سکتی ہے۔



تعلیم پر بھی بائیس خاندانوں کا قبضہ ہے

۸ جنوری کا دن نہ صرف طالبعلموں کی تاریخ میں بلکہ اس ملک کی سیاسی تاریخ میں بڑا اہم ہے۔ اس دن کراچی کے طلبا نے بہتر تعلیمی سہولتوں کے لئے متحد ہو کر پہلی بار آواز اٹھائی۔ اور تعلیم عام کرنے کے لئے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا یہاں تک کہ ۸ جنوری ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک تحریک بن گیا۔ اور اس قربانی کا ودلعیت کردہ جذبہ ہر تاریک دور میں آزادی اور خود اختیاری کی تحریکوں کی شکل میں اُبھرتا رہا۔

۱۹۶۱ء میں اسی شہر کے طالب علموں نے پہلی مرتبہ ایوبی آمریت کو للکارا، اور اس کی پاداش میں کتابیں اٹھانے والے ہاتھوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر قید خانوں کی مشقتیں اٹھوائی گئیں

۱۹۶۲ء میں جب یونیورسٹی آرڈی ننس اور تین سالہ ڈگری کورس نافذ کیا گیا تو پھر طالب علموں نے اس کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ہماری بدقسمتی کہ تین سالہ ڈگری کورس تو اس ریلے میں بہہ گیا لیکن یونیورسٹی آرڈی ننس باقی رہ گیا۔ اس کے بعد بھی مسلسل اس سیاہ قانون کی تنسیخ کے لئے طالب علموں کی تحریکیں نوجوانوں کی قربانیاں لیتی رہیں۔

۱۹۶۸ء میں ایک مرتبہ پھر طالب علموں سے جیلیں بھر گئیں اور ان کے خون سے اس دیار کی سڑکیں رنگ دی گئیں مطالبہ وہی تھا یعنی یونیورسٹی آرڈی ننس کی تنسیخ یہاں تک کہ یکم دسمبر ۱۹۶۸ء کو ایوب خان کو اس کی تنسیخ کا اعلان کرنا پڑا۔ اس زمانے میں یہ طالب علم تحریک تمام ملک میں عوام کی بحالی جمہوریت کی تحریک میں تبدیل ہو چکی تھی، جس نے ایوبی آمریت کے ایوان مسمار کر دیئے اور بالآخر طالب علموں کی قربانیوں نے قوم کو دس سالہ آمریت کے تاریک دور سے نجات دلائی۔

لیکن ایوب خان کے جانے کے بعد بھی اس بدنام زمانہ یونیورسٹی آرڈی ننس پر کوئی آنچ نہیں آئی بلکہ اس پر اسی شد و مد سے عمل جاری ہے۔ ہم یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ کیا ایوب خاں کے علاوہ بھی کچھ خفیہ ہاتھ ایسے تھے جو اپنی بقا کے لئے ہمیشہ سیاہ قوانین کی پناہ گاہیں ڈھونڈتے ہیں اور جو ایوب خان کے جانے کے بعد بھی ہماری تعلیمی زندگی پر قابض ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جس طرح ملک کی معیشت پر محض بائیس گھرانوں کا قبضہ ہے۔ اسی طرح قومی تعلیم پر بھی چند آدم جی اور چند داؤدوں کی اجارہ داری ہے جو ملک کے عوام کو اس فیضان سے محروم رکھنا چاہتے ہیں ہم ہمارے تعلیمی ادارے نوجوان ذہنوں کے استحصال کا مرکز تو نہیں بن رہے ہیں؟ ورنہ اس صورت حالی کی کیا وجہ کہ جس قانون کی تنسیخ کا مطالبہ طلبا اور اساتذہ دونوں کر رہے ہیں، جس کے خلاف کالجوں کے اساتذہ اسٹرائک کر چکے ہیں اور یونیورسٹی کے اساتذہ اسٹرائک کی دھمکی دے چکے ہیں وہ اپنی جگہ قائم ہیں۔ آخر وہ کونسی طاقتیں ہیں جو عوامی جذبوں کی راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہیں؟

حالات کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں دیگر تعلیمی ادارے طلباء اور اساتذہ جتنے انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں آزاد تھے آج ہمیں انہی آزادیوں کو محض بحال کرانے کے لئے آگ و خون کے راستوں سے گذرنا پڑ رہا ہے۔ وہ مرکز جہاں سے آزادی کی کرنیں پھوٹیں آج خود غلام ہیں۔ یہ وہی ادارے تو ہیں جن کے سائے میں بیٹھ کر ایک غلام قوم کے نوجوانوں نے افکار و عمل کی آزادی کے سبق پڑھے۔ اور وہ انگریز کی غلامی کے تاریک دور میں آزادی کے مشعل بردار بن کر نکلے۔ یہیں پران مجاہدوں سرفروشوں اور باغیوں نے تربیت پائی جنہوں نے قوم کو غیر ملکی سامراج کی غلامی سے نجات دلائی۔ ان اداروں نے آزاد ذہن اس لئے پیدا کئے کہ یہ ادارے حکومت کے دباؤ سے آزاد رہے۔ اور ان کا نظام کار جمہوری تھا۔ یونیورسٹیوں کے معاملات میں کل اختیارات ایک ایسی انجمن (SENATE) کے سپرد تھے جس کے اراکین منتخب کردہ تھے اور منتخب ہونے کے لئے انہیں عوامی جذبات و خواہشات اور قومی مقاصد کا پاس لازمی تھا۔ یہاں تک کہ وائس چانسلر بھی حکومت کی طرف سے یونیورسٹیوں پر نہیں تھوپے جاتے تھے بلکہ وہ عوامی نمائندوں کے ذریعے سینیٹ میں منتخب ہوتے تھے۔ اسی لئے وہ آمروں کے جاسوس کی بجائے قوم کے دوست فلسفی اور رہنما سمجھے جاتے تھے۔ اساتذہ اور طالب علموں کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی پوری آزادی تھی اور کبھی ان کے نظریات پر کوئی حد بندی اور پابندی حکومت کی طرف سے نہیں عائد کی گئی۔ اس لئے کہ اس قسم کی پابندیاں عائد کرنا قوم کے ذہن کو مفلوج کرنے کے مترادف ہے۔

ہمیں آزادی کا پہلا تحفہ تو یہ ملا کہ وائس چانسلر بجائے منتخب ہونے کے نامزد ہونے لگے۔ اور انہوں نے بجائے اسکے کہ طلبا کی دشواریوں کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کرنے اور دلسوزی سے انہیں دور کرتے طلبا کو کچلنے میں غیر جمہوری حکومتوں کا ہاتھ بٹایا۔ یہاں تک کہ تعلیمی اداروں میں آزادی خیال جرم ٹھہرا اور طالب علم حسرت سے یہ سوچتے رہے کہ وہ ماہرین تعلیم کہاں گئے جو حق کا ساتھ دینے کا اور ظلم سے سمجھوتہ نہ کرنے کا درس دیتے تھے اور اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ سمجھتے تھے کہ طلباء کے ذہن پر سوچ کی نئی راہیں کھول دی جائیں۔

رہی سہی کسر ایوب خاں نے یونیورسٹی آرڈی ننس کے ذریعے پوری کر دی ہر جگہ انتخاب کا اصول ختم کر کے نامزدگی کا اصول رائج کیا گیا

یونیورسٹی سینیٹ ختم کر کے ایک فرد واحد یعنی وائس چانسلر کو لامحدود اختیارات دے کر اساتذہ اور طالب علموں کے مستقبل کا مالک بنا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وائس چانسلر کے احتساب کا حق یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کو حاصل ہے۔ لیکن مذاق یہ ہے کہ سنڈیکیٹ کے ممبر خود وائس چانسلر کے ایماء پر نامزد کئے جاتے ہیں، اس لئے جو اپنے وجود کے لئے خود وائس چانسلر کے رحم و کرم کا محتاج ہو وہ کیا احتساب کرے گا۔ اساتذہ کا تقرر سلیکشن کمیٹی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اراکین بھی وائس چانسلر ہی منتخب کرتے ہیں، اس لئے ان سے وائس چانسلر کے من مانے فیصلوں سے اختلاف کی توقع رکھنا بیکار ہے۔

اساتذہ و طلباء پر تمام سیاسی سرگرمیوں کے راستے بند ہیں انہیں اظہار خیال کی آزادی نہیں۔ حالانکہ جسے اظہار خیال تک کی آزادی نہ ہو اسے استاد کہنا مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ طالب علم یونینوں کے دستور منسوخ کر دیئے گئے اور ایک انتہائی لغو اور غیر جمہوری دستور مسلط کر دیا گیا تاکہ طلبا میں خود اعتمادی کی کوئی رمق باقی نہ رہے۔ طالب علموں کے بغیر وجہ بتائے داخلے منع کئے جا سکتے ہیں، سال کے دوران نکالا جا سکتا ہے۔ اور ان تمام بے انصافیوں کے خلاف قانون سے دادرسی بھی حاصل نہیں کی جا سکتی جو ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔

خدا کے فضل سے ہمارے وائس چانسلروں نے ان اختیارات کو خوب خوب استعمال کیا یہاں تک کہ یونیورسٹیاں رجواڑوں سے بدتر ہو گئیں، جہاں مہذب دنیا کا کوئی قانون لاگو نہیں جسے چاہیں ترقی دے۔ جسے چاہیں نکال دیں، جس طالب علم کو چاہیں ہمیشہ کے لئے تعلیم سے محروم کر دیں۔ نہ کوئی علمیت کی قدر رہی نہ اہلیت کا تذکرہ ہر وقت شیخ الجامعہ کے دفتر میں اور گھروں پر دربار لگے رہتے ہیں۔ ہر تقریب میں مہمان خصوصی

بنا کر بلائے جاتے ہیں گلے میں سنہری ہار ڈال کر سپاسنامے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اساتذہ اور طلباء کے لئے یہی طریقے ترقی کے ضامن ہیں۔ نہ کوئی علمی گفتگو ہے نہ تنقیدی محفلیں جن سے ذہن کو جلاملے یونیورسٹیوں کو شہر کی علمی سرگرمیوں کا مرکز ہونا چاہئیے۔ لیکن اس شہر کی علمی وادبی زندگی یونیورسٹی سے باہر بستی ہے۔

۸ جنوری ۳ ۵ کو ہم نے بحیثیت طالب علم کے یہ مطالبہ کیا تھا کہ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔ ۸ جنوری ۷۱ء کو ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اداروں کی رہی سہی آزادیاں بھی سلب کر لی گیئں۔ اور اب ہم یہ مطالبہ کرتے ہے کہ اسس گھٹن کے ماحول کو ختم کرو ہمارے اساتذہ اور طلبا کو آزادی سے سوچنے اور کام کرنے کی اجازت دو ورنہ تمہارے تعلیمی اداروں کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

ایک طالب علم

پاکستان کے لوگو! بنیادی حقوق ہمیں کیوں نہیں دلواتے؟

گلگت بلتستان کے علاقے شاندار ماضی کے حامل ہیں۔ یہاں کے عوام کی جنگ آزادی عوامی جنگوں کی تاریخ میں ایک اعلیٰ مقام کی مستحق ہے۔ یہاں کے عوام نے ڈنڈوں۔ پتھروں، کلہاڑیوں، تلواروں اور دیسی ساخت کی بندوقوں سے جدید اسلحہ سے لیس ڈوگرہ افواج کا مقابلہ کیا۔ ؎

بندوق دیسی ساخت کی، زیر کمر کلہاڑیاں

اس علاقے کے جیالوں نے ۱۵ ہزار فٹ کی بلندیوں پر برف میں خوراک اور مناسب کپڑوں کے بغیر ڈوگرہ فوج سے نبرد آزما ہو کر اپنے جوہر دکھائے۔

؎ کھال بکری پیر کو، چوغا ہو یا کہ سوٹ ہو
ڈوگروں سے چھین لیتے سُرخ، برانڈی بوٹ ؎

وہاں کے غیور عوام نے بغیر کسی بیرونی امداد کے اور بے سروسامانی کے عالم میں ڈوگروں سے نہ صرف اسلحہ اور کپڑے تک چھین لئے بلکہ تقریباً ۳۰ ہزار مربع میل دفاعی اعتبار سے اہم علاقے کو آزاد کرا لیا۔ اور اس اتنے بڑے اور اہم علاقے کو حکومتِ پاکستان کی تحویل میں عارضی طور پر دیدیا حکومت پاکستان نے وہاں کے عوام کے اس خلوص اور احسان کا بدلہ "ایف سی آر" جیسے کالے قانون سے دیا۔ یہ رسوائے زمانہ قانون ۱۹۰۱ء میں انگریز سرکار نے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں کے لوگوں کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے بنایا تھا۔ خیال تھا کہ ہنگامی حالات کے خاتمے کے بعد اس رُسوائے زمانہ قانون کو ختم کیا جائے گا۔ لیکن آج ۲۳ سال کے بعد بھی وہاں کے عوام اس کالے قانون کے تلے کراہ رہے ہیں۔ پاکستان کی نوکر شاہی کو اس بات کا احساس بھی نہیں کہ وہاں کے عوام بھی انسان ہیں ان کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ وہ پاکستان کے ساتھ ہمیشہ خلوص سے پیش آئے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی بقا کیلئے اپنے ہزاروں فرزندوں کی قربانیاں دی ہیں۔ اور دیتے آرہے ہیں۔ وہاں کے عوام کوئی مال مویشی نہیں کہ جب پاکستان کو قربانی کی ضرورت پڑے پکڑ لائے ور قربان کر دے۔ وہ پاکستان کے لئے قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ اور مستقبل میں بھی پاکستان کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار رہیں گے۔ بشرطیکہ حکومتِ پاکستان انہیں اپنا بھائی سمجھے اور ان کے سیاسی حقوق بحال کرے۔

آج حکومتِ پاکستان دنیا کے دیگر مظلوم عوام کے حق میں آواز بلند کر رہی ہے۔ جب کہ خود پاکستان میں ۶ لاکھ بھائی خستہ حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میں پاکستان کے بارہ کروڑ عوام سے پوچھتا ہوں کہ آپ تو جمہوریت کی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ آپ نے اپنے نمائندے چنے ہیں۔ آپ مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کے لئے تڑپ رہے ہیں جب کہ آپ کے مسلمان بھائی گلگت بلتستان کے چھ لاکھ عوام جمہوری حقوق سے محروم ہیں۔ آپ کے دلوں میں ان کے لئے درد کیوں نہیں ہے۔؟ کیا آپ بھی ہمیں قربانی کا بکرا تصور کر رہے ہیں؟ اگر نہیں تو آپ ہمیں ظلم سے نجات دلانے کے لئے آواز کیوں بلند نہیں کر رہے ہیں۔؟ آپ ہمیں بنیادی انسانی حقوق کیوں نہیں دلواتے؟

ہم اپنے حقوق کے حصول کے لئے آج تک حکومتِ پاکستان سے پُرامن ماحول میں مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ ان مطالبات کے حصول کے لئے جموں وکشمیر محاذ رائے شماری برائے آزاد کشمیر و پاکستان کے چند رہنما جناب مقبول بٹ کی قیادت میں پچھلے دنوں گلگت گئے تھے۔ گلگت میں ان کی آمد کو انتظامیہ نے اپنے وقار کے لئے ایک چیلنج سمجھا اور ان کو پولیس گاڑیوں میں بند کر کے علاقہ غیر کوہستان میں لا کر چھوڑ دیا۔ دوسری بار پھر یہ رہنما اپنے چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ گلگت گئے تو وہاں کی انتظامیہ نے ان کو پھر گرفتار کر لیا۔ اس مرتبہ ان کے ساتھ محاذِ رائے شماری کے مرکزی پبلسٹی بورڈ کے چیئرمین جناب امان اللہ خاں کو گلگت میں گرفتار کر کے نظر بند کر دیا اور دوسرے اراکین محاذ کو جبراً راولپنڈی واپس بھیج دیا گیا۔ جناب امان اللہ خاں گلگت ایجنسی ہی کے باہمت فرزند ہیں۔ ان کو گلگت کی انتظامیہ نے گلگت سنٹرل جیل میں بغیر مقدمہ چلائے قید کر لیا۔ اب ان کے خلاف الزامات کا فیصلہ ریذیڈنٹ صاحب کریں گے۔ کیونکہ ریذیڈنٹ صاحب یہاں کے ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور واحد جج بھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پولیس کے سربراہ بھی ہیں اور انتظامیہ کے بھی۔

جناب امان اللہ خاں بی اے ایل ایل بی ہیں۔ اور "ہمارے نظریات" "ایف ایل این، الفتح اور کشمیری نوجوان" اور "فری کشمیر" (FREE KASHMIR) نامی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تقریباً چار سال تک کراچی سے ایک سیاسی ماہنامہ "دی وائس آف دی کشمیر" بھی نکالتے رہے ہیں۔ اب اُن کو گلگت جیل میں اخلاقی مجرموں کے ساتھ رکھا گیا ہے اور انہیں "سی" کلاس دی گئی ہے۔ جناب امان اللہ خاں نے کوئی اخلاقی جرم نہیں کیا ہے بلکہ وہ صرف وہاں کے چھ لاکھ عوام کے مندرجہ ذیل مطالبات منوانے کے سلسلے میں محاذ رائے شماری کی ملک گیر مہم کے سلسلے میں گئے تھے، یہ مطالبات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ گلگت بلتستان کے چھ لاکھ عوام کو ان کا بنیادی حق "حق رائے دہی" دیا جائے۔

۲۔ گلگت بلتستان سے رسوائے زمانہ "ایف سی آر" کو فوراً ختم کیا جائے۔

۳۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے بالکل الگ کر کے انصاف کے بنیادی تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

۴۔ گلگت بلتستان میں نام نہاد مشاورتی کونسل کے جو انتخابات "ایف سی آر" اور دفعہ ۱۴۴ کے زیر سایہ ہوئے ہیں۔ انہیں فوراً منسوخ کیا جائے۔

۵ گلگت بلتستان میں مقامی سرکاری اور نیم سرکاری ملازمتوں میں مقامی لوگوں کو ترجیح دی جائے۔

۶۔ نگر اور پونیال میں ہونیوالی فائرنگ کی ہائیکورٹ کے کسی جج کی سربراہی میں ایک کمیشن سے تحقیقات کرائی جائے مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ اور مقتولین کے ورثا کو مناسب معاوضہ دیا جائے۔

۷۔ پاکستان کے فنی اداروں میں گلگت بلتستان کے طلبہ کے لئے مخصوص نشستیں کم از کم دُگنی کی جائیں۔

۸۔ کراچی میں ڈو میڈیکل کالج۔ این ای ڈی انجینئرنگ کالج اور لیاقت میڈیکل کالج حیدر آباد میں منسوخ شدہ سیٹوں کو بحال کیا جائے۔

۹۔ جنس مالیہ کے نظام کو ختم کیا جائے۔

۱۰۔ چلاس۔ راوپل۔ تانیگر اور دیگر علاقوں کے عوام کو جنگلات کی آمدنی کا مناسب حصہ دیا جائے۔

۱۱۔ جلکوٹ وغیرہ کے "شنا" بولنے والے کوہستانی علاقوں کو گلگت ایجنسی میں شامل کیا جائے۔

کیا ان مطالبات کے حق میں نعرہ لگانا بغاوت ہے؟ کیا یہ امان اللہ خاں کا ذاتی مسئلہ ہے؟ خدانخواستہ اگر آپ پر یہ زیادتی ہوتی تو آپ برداشت کرتے؟ ہرگز نہیں۔ آپ نے ایوب خاں کی آمریت کے بت کو توڑ کر ثابت کر دیا ہے کہ آپ کسی کی غلامی برداشت نہیں کرتے۔ تو پھر کیوں گلگت بلتستان کے عوام پر ظلم ہو رہا ہے اور آپ تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔

ایس آر خاں ۲۔ کے ایم سی
بلڈنگ۔ بی مارکیٹ۔ کراچی نمبر ۲

مکتوب پشاور:۔ فارغ بخاری

پشاور میں بھی عوامی عدالت لگ گئی

نیشنل پریس ٹرسٹ کے خلاف کمسن لڑکوں کی بھوک ہڑتال

سرحد میں وزارت کون بنائے گا

انتخابات ہماری آخری منزل نہیں، ہماری منزل انقلاب ہے

بھٹو

پشاور میں بھی عوامی عدالت لگ گئی۔ یہاں اس کے آغاز کا فخر طلبا کی تنظیم این ایس ایف نے حاصل کیا۔ ۱۴ جنوری کو چوک یادگار میں طالب علم رہنما قمر عباس کی قیادت میں چار طلبا کے پہلے گروپ نے کیمپ لگا کر بھوک ہڑتال شروع کی، روزانہ چار طلبا کے شامل ہونے کا پروگرام تھا۔ تیسرے دن راقم الحروف اپنے تین ادیب ساتھیوں کے ساتھ بھوک ہڑتال میں شریک ہو رہا تھا کچھ طامات اور ٹریڈ یونینوں کے کارکنوں کی فہرست بھی ہمارے سامنے تھی لیکن ۱۵ کی صبح اچانک اطلاع ملی کہ صحافی جیت گئے پریس ٹرسٹ کے فرعونوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو کی مداخلت سے بھوک ہڑتال ختم کر دی گئی۔ یہاں پہلے گروپ کے ہڑتالیوں میں قمر عباس کے علاوہ یعقوب سیٹھی امداد علی روشن اور ملک زڑاور رخان طالب علم شامل تھے ان میں سے دو طلبا کالج کے تھے اور دو میٹرک کے۔ میٹرک کے طالب علموں میں یعقوب سیٹھی ۱۳ برس کا کمسن نوجوان اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا ہے جسے اس کے والد نے نہایت جرأت مندی سے پہلے گروپ میں پیش کیا رخصت کے وقت اس کی والدہ کے یہ الفاظ تھے کہ اگر پیٹھ دکھائی تو اپنا دودھ نہ بخشوں گی قوم کے یہ ہونہار بچے ترقی پسند صحافیوں پر پریس ٹرسٹ کی ظالم انتظامیہ کے استحصال کے خلاف اپنی جانوں پر کھیل کر پشاور کی زہریلی سردی میں ساری رات کھلے کیمپ میں پڑے رہے لیکن ان کے آہنی عزم کو سیاسی لیڈروں کی نصیحتیں حکام کے نیک مشورے اور پولیس کی دھونس بھی نہ پگھلا سکی، سچ پوچھتے تو ان نابالغ بچوں کے اس دلیرانہ اقدام نے صوبہ سرحد کے غیور پٹھانوں کی لاج رکھ لی اور اس علاقے کے سینکڑوں بالغ صحافیوں کو ایسی غیرت دلائی کہ اگر ان میں غیرت و حمیت کا شائبہ بھی ہوتا تو اب تک کہیں نہ کہیں ڈوب مرے ہوتے صوبہ سرحد کے طول و عرض میں اخبارات کے دوسرے عملے کے علاوہ سینکڑوں کارکن صحافی ہیں لیکن ان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ ہمدردی کی کوئی قرارداد تک پاس نہیں کی گئی کسی صحافی کو اپنی برادری کے مظلوم ہڑتالیوں کے حق میں ایک بیان تک دینے کی توفیق نہیں ہوئی بلکہ اس تحریک کی خبریں چھاپنے میں بھی نہایت بخل کا مظاہرہ کیا گیا۔ خصوصاً ان میں جو بڑے انقلابی اور سوشلسٹ بننے کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں ان کی بھی ساری قلعی کھل گئی اس سارے ہنگامے میں وہ یوں چپ سادھ کر بیٹھے رہے جیسے ان کی سننے اور بولنے کی قوت سلب ہو چکی ہو۔

سرحد میں وزارت سازی

تین وزیر اعلیٰ تیار ہو گئے

جمعیت العلما (ہزاروی گروپ) کے رہنما مفتی محمود صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ سرحد کی صوبائی حکومت میں جو پارٹی وزیر اعلیٰ ہمارا بنانے کی شرط قبول کرے ہم اس کے ساتھ اشتراک کریں گے۔ یہاں جمعیت نے ۴۰ صوبائی سیٹوں میں سے بمشکل ۶ حاصل کی ہیں۔ ۱۳ نیپ اور ۹ قیوم لیگ کی ہیں۔ یہ دونوں جماعتیں اپنی وزارت بنانے کے لئے ابھی سے تگ و دو میں مصروف ہیں آزاد ممبروں کے علاوہ جمعیت کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے ابھی دونوں کوشش کر رہی ہیں لہذا انہوں نے گرمی بازار دیکھ کر بھاؤ بڑھا دیا لیکن ہم کہتے ہیں اسلامی لحاظ میں جو اپنے اصولوں کی قربانی انہوں نے پیش کی ہے اس کے پیش نظر یہ سودا اب بھی سستا ہے۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ادھر صوبائی آزاد ممبر اسلم خٹک صاحب ہیں ان کے زیر اثر کونسل لیگ کا صوبائی ممبر سیف اللہ خاں ہیں اسلم خٹک نے ولی خاں کی حمایت سے اس وعدے پر کامیابی حاصل کی کہ وہ ان کا ساتھ دیں گے لیکن کامیابی کے بعد قیوم خاں سے نگاہیں لڑانے لگے اور اب خیر سے یہ بھی وزارت اعلیٰ سے کم کسی چیز پر رضامند ہوتے نظر نہیں آتے اس طرح اس وقت یہاں پوزیشن یہ ہے کہ جو پارٹی بھی وزارت بنانا چاہے اسے فی الحال کم از کم دو وزیر اعلیٰ تو باہر سے لینے ہوں گے اور ایک اس کا اپنا ہوگا۔ باقی رہے وزیر تو جہاں تین وزیر اعلیٰ ہوں وہاں وزیروں کی تعداد کا آپ خود اندازہ لگا لیجیے۔

میری جیت عوام کی جیت

بھٹو

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا طیارہ ۱۰ جنوری کو ۹½ بجے صبح کے بجائے ۱½ بجے دوپہر پشاور کے ہوائی اڈہ پر اترا جہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ ۱۰ بجے سے ان کے انتظار میں کھڑے تھے ہوائی مستقر کی فضا جیو بھٹو، سوشلزم زندہ باد، قائد عوام زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی پیپلز پارٹی کے رہنما پر چاروں طرف سے پھولوں کی بارش ہونے لگی اور وہ کہہ رہے تھے۔

"میری جیت عوام کی جیت ہے میں عوام کا خادم ہوں جب تک میں سوشلزم کے متعلق عوام سے کئے ہوئے وعدے پورے نہ کروں چین سے نہیں بیٹھوں گا انتخاب ہماری آخری منزل نہیں، ہماری منزل انقلاب ہے ملک میں معاشی انقلاب لانے تک ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔"

جلوس روانہ ہوا، قائد عوام حسب معمول ایک ٹرک کی چھت پر کھڑے تھے۔ جن کے گرد ان کے نوجوان فدائیوں کا ہجوم تھا۔ ارباب روڈ تک پہنچتے پہنچتے لاکھوں کا مجمع ہو چکا تھا ایک میل لمبے جلوس میں حد نظر تک سر ہی سر نظر آتے تھے نوجوان بھنگڑا ڈال رہے تھے ناچ رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے اور گا رہے تھے۔

مانگ رہا ہے ہر انسان

روٹی، کپڑا اور مکان

پورے چار گھنٹوں میں یعنی ۵½ بجے یہ جلوس سوئیکارنو چوک پہنچا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی پولیس کے وسیع تر انتظامات کے باوجود ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود یہاں پورے نصف گھنٹے تک بھٹو صاحب کی تقریر کو پورے سکون اور تحمل سے سنا گیا۔

اس سے ایک روز پہلے چوک یادگار میں قیوم خاں کے جلسے میں جب وہ اپنی تقریر میں نیپ کے رہنماؤں پر برسنے کے بعد پیپلز پارٹی کے قائد کو تنقید کا ہدف بنانے لگا تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بھٹو زندہ باد اور پیپلز پارٹی زندہ باد کے نعروں کی گونج میں یہ جلسہ ختم کرنا پڑا لیکن اس کے بعد جلسہ کے منتظمین نے آتش انتقام بجھانے کے لئے ایک غیر قانونی جلوس نکالا اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو زدوکوب کرنے کے بعد پارٹی کے دفتر پر نہ صرف سنگباری اور فائرنگ کی بلکہ دفتر میں داخل ہو کر تمام فرنیچر اور ریکارڈ تباہ کر دیا جس میں پارٹی کے بہت سے کارکن شدید زخمی ہوئے۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ اعلیٰ حکام کو اس کی اطلاع دی گئی رپورٹ درج کرائی گئی لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی بلکہ الٹا پیپلز پارٹی کے کارکن گرفتار کئے گئے۔ دوسرے دن ان کے چند افراد کو حراست میں لیا گیا اور پھر تھانے ہی سے سب کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ لیکن جلوس کے سرغنوں کو کسی نے پوچھا تک نہیں۔

قیوم لیگ کے حنیف خاں ہزارہ مردان اور پشاور سے یوسف خٹک کامیاب ہو گئے۔ اس کامیابی کے بعد تمام رات اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں تقریباً ۰۰ جلوس نکال کر اس سلسلے کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا گیا۔ یہ جلوس شہر میں دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کے باوجود کھلے بندوں نکالے گئے پولیس حکام اور انتظامیہ منہ دیکھتے رہے اور انہوں نے کوئی نوٹس لینا مناسب نہ سمجھا صرف یہی نہیں بلکہ بے تحاشا فائرنگ کی گئی۔ مخالف امیدواروں کے کارکنوں کے گھروں پر اور دفتروں پر پتھراؤ کیا گیا۔ بینرز جلائے گئے۔ یہ سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ پیپلز پارٹی سرحد کے چیئرمین محمد حیات شیرپاؤ کو اپنے ستارہ اراکین کو لے کر احتجاج کرنے کے لئے گورنر کے پاس جانا پڑا لیکن غالباً انہوں نے بھی بے بسی ظاہر کی۔

حالانکہ انہوں نے کوئی قلعہ فتح نہیں کیا بلکہ اپنی ہی نشستیں جیتی ہیں۔ لیگیوں کی غیر قانونی حرکات اور انتظامیہ کی چشم پوشی کا یہی عالم رہا تو خدشہ ہے کہ یہاں حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے اور اس وقت امن قائم کرنے کی کوشش آسانی سے بار آور نہ ہو سکیں گی خدا کرے یہ نوبت نہ آنے پائے۔

آج پورے صوبہ سرحد کے باشعور حلقے یہ سوچتے ہیں کہ اس الیکشن میں پشاور اور مردان ہزارہ کے دونوں حلقوں میں بائیں بازو یعنی نیپ اور پیپلز پارٹی کے امیدوار جیت سکتے تھے۔ اگر آپس میں افہام و تفہیم کر کے سمجھوتہ کر لیتے۔ آخر دولتانہ اور قیوم خاں ایک ساتھ ہو سکتے ہیں۔ تو سوشلزم پر یقین رکھنے والی پیپلز پارٹی اور نیپ کے رہنما کیوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں کی نا اتفاقی سے رجعت پسندوں کو فائدہ پہنچا۔ اگر اس ایک واقعہ سے ترقی پسند جماعتوں کے رہنما سبق حاصل کر کے مستقبل میں متحدہ جدوجہد کے لئے اکٹھے ہو جائیں۔ تو بڑی اچھی بات ہو گی۔

دولت مشترکہ کانفرنس میں کشمیر کا تذکرہ

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

ہندوستانی حکومت نے ایک بار پھر کشمیر میں اپنی ننگی جارحیت کا مظاہرہ شروع کر دیا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ۹ جنوری کو کشمیر کی کٹھ پتلی حکومت نے شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کے کشمیر میں داخلہ پر پابندی لگا دی ہے۔ پابندی کا یہ حکم شیخ عبداللہ کو اس وقت دیا گیا جب وہ مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے پچاس ہزار روپے کا چیک دہلی میں پاکستان ہائی کمشنر کو دینے گئے تھے۔ مرزا افضل بیگ دہلی سے جب بذریعہ کار سرینگر واپس آ رہے تھے تو راستے میں انہیں کشمیر میں داخلے پر پابندی کا حکم ملا۔ ۹ جنوری کی رات کو صادق کی حکومت نے محاذ رائے شماری کے تین سو کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔!

صادق حکومت کے اس اقدام سے مقبوضہ کشمیر کے عوام میں سخت اشتعال پھیل گیا ہے۔ سرینگر اور وادی میں مکمل ہڑتال رہی۔ ہڑتالی مظاہرین پر صادق کی پولیس نے کئی جگہ لاٹھی چارج کیا اس میں پچاس افراد زخمی ہو گئے۔ ۱۰ جنوری کو پولیس کے تشدد اور مقبوضہ ریاست میں کشمیری رہنماؤں کے داخلہ پر پابندی کے خلاف سرینگر میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ پولیس نے کئی مقامات پر مظاہرین پر گولی چلا دی۔ اخباروں کی اطلاع ہے کہ ۷ افراد ہلاک دو سو زخمی ہو گئے۔ سرینگر میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔ اس کے بعد مزید پانچ سو افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔

حالات کو بے قابو ہوتے دیکھ کر ۱۲ جنوری کو ہندوستانی حکومت نے محاذ رائے شماری کو غیر قانونی قرار دے دیا اور محاذ کے دفاتر پر پولیس نے قبضہ کر لیا۔ محاذ کے سکریٹری جناب صدر الدین مجاہد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ہندوستانی حکومت نے اس کارروائی کا جواز یہ پیش کیا کہ محاذ کے لیڈر ریاست کو ہندوستان سے الگ کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔!

ہندوستانی حکومت کی یہ دہشت گردی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے دورہ کشمیر کے اچانک بعد شروع ہو گئی ہے۔ اندرا گاندھی کے دورہ کشمیر کے دوران میں بھی سرینگر اور دوسرے مقامات پر کشمیری حریت پسندوں کے مسلسل مظاہرے ہوتے رہے مسز اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ کو توڑ کر نئے انتخابات کا جو ڈول ڈالا ہے، اس کی بناء پر مقبوضہ کشمیر میں بھی عام انتخابات ہوں گے انتخابات سے کچھ ہی روز قبل کشمیر میں اس دہشت گردی کا مقصد یہ ہے کہ ان سارے لیڈروں کو قید کر دیا جائے جو عام انتخابات کے نتائج پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اور اپنے فرمانبردار ٹوڈی جی ایم صادق کی کامیابی کا راستہ صاف کیا جائے۔

کشمیر کے سلسلے میں ہندوستان کا موقف حالات کے مطابق بدلتا رہا ہے۔ پنڈت نہرو نے اقوام متحدہ میں اس بات کی یقین دہانی کرائی تھی کہ کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کے فیصلہ کا موقعہ دیا جائے گا۔ لیکن امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدوں میں پاکستان کی شرکت کے بعد پنڈت نہرو نے اپنی سابقہ یقین دہانیاں یک قلم ترک کر دیں اور اچانک یہ موقف اختیار کیا کہ ان دفاعی معاہدوں سے صورت حال بدل گئی ہے لہذا ہندوستان رائے شماری کا پابند نہیں۔ پنڈت جی کا یہ عذر لنگ مقبوضہ کشمیر کو اپنے شکنجے میں مستقل طور پر رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔ اس کے بعد کانگریسی حکمرانوں نے کشمیر کو ہندوستان کا "اٹوٹ انگ" قرار دے کر مسئلہ کشمیر کو اپنی طرف سے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

کشمیر کے سلسلے میں بڑی طاقتوں کی پالیسی غیر قانونی، غیر اخلاقی اور بے اصولی پر مبنی رہی ہے۔ مسئلہ کشمیر تو برطانوی سامراج کا پیدا کیا ہوا ہے لیکن کشمیری عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے اقوام متحدہ اور اس کے باہر برطانیہ ایک عرصے تک کشمیری عوام کے حق خود ارادیت کی حمایت کرتا رہا۔ اس طرح امریکہ نے بھی پاکستان کی حمایت کو اس بات سے مشروط رکھا ہے کہ پاکستان کس حد تک سامراج کی حضوری کرتا ہے۔

پچھلے ۲۳ سال میں کشمیر کے سلسلے میں اور سیاسی سفارتی سطح پر پاکستان کو شدید ناکامیاں اٹھانی پڑی ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں دولت مشترکہ کی سالانہ کانفرنس منعقدہ برطانیہ میں وزیر اعظم لیاقت علی خاں مرحوم نے ابتداً محض اس بناء پر شرکت سے انکار کر دیا تھا کہ کانفرنس کے ایجنڈے میں کشمیر کا مسئلہ شامل نہ تھا۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ اسلامی ملکوں کی کانفرنس میں بھی جو پچھلے ماہ کراچی میں منعقد ہوئی تھی، کشمیر کا مسئلہ زیر بحث نہ آسکا۔ سنگاپور میں دولت مشترکہ کی ۱۷ ویں کانفرنس جو پچھلے ہفتے ہوئی، اس کانفرنس میں بھی مسئلہ کشمیر ایجنڈے پر نہ تھا۔ جب پاکستانی وفد کے سربراہ اور حکومت کے وزیر جناب احسان الحق صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں مسئلہ کشمیر پر گفتگو کرنا چاہی تو ہندوستانی وفد کے سربراہ سورن سنگھ نے صرف اس پر اعتراض کیا بلکہ سنگاپور کے وزیر اعظم نے بھی جو اجلاس کے صدر تھے مداخلت کرتے ہوئے ہندوستانی وفد کو یقین دلایا کہ وہ بحیثیت صدر اجلاس پاکستانی وفد کے سربراہ کو مسئلہ کشمیر پر اس سے زیادہ آگے جانے نہیں دیتے" بین الاقوامی قسم کی کانفرنسوں میں پاکستان کی یہ توہین محض ہے کہ اس نے امریکی سامراج اور اس کے حواریوں سے دوستی کا رشتہ باندھا اور ان سے وفا کی امید کی۔



قوموں کی حق خود ارادی انکا ایک مسلمہ اور بنیادی حق ہے لیکن سامراجیوں اور ان کے حواریوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں عوام سے ان کا یہ حق غصب کر رکھا ہے، جنوبی افریقہ، روڈیشیا اریٹیریا، انگولا اور موزمبیق کے عوام ایک عرصے سے اپنے حق خود ارادی اور غیر ملکی طاقتوں سے آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ بڑی حد تک سامراجی ملکوں کی مصلحتوں کے تابع ہے۔ بڑی طاقتیں ہر مسئلہ کی تائید یا تردید اپنے مفادات کی روشنی میں کرتی ہیں۔ ان حالات میں لازمی صورت یہی رہ جاتی ہے کہ مقبوضہ ریاستوں کے عوام اپنی طاقت پر بھروسہ کریں۔ اور ان طاقتوں سے اپنا رشتہ جوڑیں جو محکوم اقوام کی آزادی عزیز رکھتی ہیں اور دنیا میں ہر جگہ جہد آزما قوموں کی اخلاقی اور مادی حمایت کر رہی ہیں۔

پاکستان میں حالیہ انتخابات کے نتیجے میں جو پارٹیاں برسر اقتدار آنیوالی ہیں انہوں نے کشمیری عوام کی حمایت کا اعلان کیا ہے۔ مستقبل میں برسر اقتدار آنیوالی حکومت کا فرض ہے کہ وہ کشمیر کے سلسلے میں ایک موثر پالیسی اختیار کرے۔ کشمیری عوام کی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں ان کی مادی امداد آنے والی حکومت کی بنیادی پالیسیوں میں شامل ہونی چاہیئے۔

علاوہ ازیں آزاد کشمیر میں جمہوری آزادی اور معاشی معاشرتی تعلیمی اور فنی ترقی کا ایک ایسا شاندار معیار قائم ہونا چاہیئے کہ مقبوضہ علاقے کے عوام کے لئے یہ ایک مثال ہو اور ان کی جدوجہد کو اس سے مزید ترغیب ملے۔

اردن کے فدائیوں کا قتل عام

شاہ حسین فوجی کارروائیوں سے مطمئن ہیں

راجرز منصوبے کے بعد اردن میں فلسطینی مجاہدین اور اردنی افواج کے درمیان خونریز جنگ ہوئی تھی اس کی تباہیوں کے نشانات ابھی پوری طرح مٹ نہ سکے تھے کہ اردن میں فلسطینی مجاہدین پر اردنی افواج کے تازہ حملوں کی خبریں آنے لگی ہیں۔ ۱۲ جنوری ۱۹۷۱ء کی ایک خبر کے مطابق امریکہ نے فلسطینی تحریک آزادی کو ختم کرنے کے لئے اردن کی

شاہی افواج کو ایک منظم منصوبہ بنا کر دیا ہے۔ فرانسیسی خبر ایجنسی رائٹر کی اطلاع کے مطابق اردن کی مسلح افواج اور پولیس کی مدد کے لئے امریکہ نے اپنے کچھ فوجی دستے بھی اردن بھیج دیئے ہیں۔

۱۰ جنوری کو الفتح کے دفتر اطلاعات نے بتایا کہ بقاعہ کے مہاجر کیمپ سے سینکڑوں فلسطینی مہاجرین دریائے اردن کے مغربی کنارے کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ دفتر اطلاعات کی خبر کے مطابق اردنی ٹینکوں نے کیمپ کا محاصرہ کر رکھا ہے اور ہوائی فائر کے ذریعے فلسطینی مہاجرین کو دہشت زدہ کر کے کیمپ سے بھگایا جا رہا ہے۔ اعلان کے مطابق تین دن سے اردنی افواج جراش مسلط اور روزفیہ پر مسلسل گولہ باری کر رہی ہیں۔ یہ تینوں ٹھکانے چھاپہ ماروں کے مرکز ہیں۔

شاہ حسین، اس تازہ جارحیت کے دوران میں، اردن سے باہر تھے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کارروائی، ان کی ایماء اور اجازت کے بغیر ہوئی ہے۔ شاہ حسین، حال ہی میں امریکہ اور دوسرے سامراجی ملکوں کے دورے سے واپس ہوئے ہیں امریکی صدر نکسن اور فرانس اور برطانیہ کی حکومتوں سے ان کی طویل ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ اردن کے شاہ اور امریکی صدر نکسن دونوں اردن میں امن کے خواہاں ہیں اور امریکی سامراج کے فلسفے کے مطابق کسی ملک میں امن صرف اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب اس ملک کے حریت پسندوں کو کلیتاً ختم کر دیا جائے۔ فلسطینی عوام اور چھاپہ ماروں کے خلاف اردنی افواج کی حالیہ کارروائیاں اسی فلسفہ کا عملی اظہار معلوم ہوتی ہیں۔ خود شاہ حسین نے اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ حسن کے نام ایک پیغام میں اردنی افواج کی کارروائیوں پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

اردنی افواج جب بھی مظلوم فلسطینی عوام اور چھاپہ ماروں کا قتل عام شروع کرتی ہیں، عرب ممالک ازراہ ہمدردی فوری طور پر ایک عدد مصالحتی کمیٹی بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ مصالحتی کمیٹی کے صدر جناب لدغم صاحب حالیہ اردنی جارحیت کے مسئلہ پر شاہ حسین سے بات چیت کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ کراچی کے ایک اردو روزنامہ کے خیال کے مطابق، شاہ حسین کے اپنے بھائی کے نام پیغام کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مصالحتی کمیٹی کے صدر کے ساتھ شاہ اردن کا رویہ کیا ہو گا اور کم و بیش یہی صورت عرب سربراہوں کے نمائندوں کے ہنگامی اجلاس میں پیش آسکتی ہے۔ یہ اجلاس اردن کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے عنقریب ہو گا۔

جب بھی فلسطینی حریت پسند اسرائیل کے خلاف چھاپہ مار کارروائیاں شروع کرنے کے قابل ہوتے ہیں، اردنی افواج انہیں تباہ کر دیتی ہے۔ جب تک اردن کے اقتدار پر سامراجیوں کا غلبہ رہے گا، فلسطین کے حریت پسند اپنی سرزمین کو اسرائیل کے استبداد سے آزاد نہیں کرا سکیں گے۔

مزدوروں کے روز و شب

داؤد ملز کے مزدور رہنماؤں پر کیا گذری!

داؤد ٹیکسٹائل ملز کی ہڑتال ختم ہوئے اب تقریباً دس ماہ ہو رہے ہیں۔ لیکن داؤد ملز کے مزدور رہنماؤں پر مقدمات ابھی تک چل رہے ہیں۔ ان میں جناب ریاض حسین خاں کو پہلے ملٹری کورٹ سے ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی بعد میں اسپیشل ملٹری کورٹ سے ۷ر جنوری کو چار سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ اور اب سول کورٹ میں دو علیحدہ علیحدہ کیس میں مختلف دفعات کے تحت مقدمات زیر سماعت ہیں۔ عزیز الحسن کو ملٹری کورٹ سے ایک سال تین ماہ قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ اب سول کورٹ میں مندرجہ بالا دفعات کی تحت مقدمات زیر سماعت ہیں۔ داؤد ٹیکسٹائل ملز لیبر یونین کے صدر جناب خواجہ نجیب الدین کو سمری ملٹری کورٹ سے ۹ ماہ کی سزا سنائی گئی تھی اب متعدد سول دفعات کے تحت مقدمات زیر سماعت ہیں۔ داؤد ملز کے دو اور مزدور کارکنوں اقبال خاں اور شاہجہاں کو سمری ملٹری کورٹ سے ۷ ماہ اور ۷ ماہ کی سزا دی گئی۔ یہ سارے مزدور اب خیرپور جیل میں ہیں۔

۱۱ر جنوری کو ریاض حسین خاں، خواجہ نجیب الدین اور عزیز الحسن کو خیرپور جیل سے سول عدالت (کراچی) میں مقدمات کی سماعت کے لئے کراچی لایا گیا۔ ۱۱ر تاریخ کو انہیں عدالت میں پیش کیا گیا۔ عدالت نے آئندہ سماعت کی ۴ر فروری کی تاریخ مقرر کی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جب سپاہی ان "مجرموں" کو عدالت کی ہدایت کے مطابق لے کر کراچی سنٹرل جیل پہنچے تو جیل کے حکام نے انہیں کراچی جیل میں رکھنے سے صاف انکار کر دیا اور عذر یہ پیش کیا کہ "مجرم" مارشل لاء کورٹ کے سزا یافتہ ہیں۔ لہٰذا مارشل لاء حکام کی اجازت کے بغیر انہیں کراچی جیل میں نہیں رکھا جا سکتا۔ کراچی جیل کے حکام کے اس رویہ کی وجہ سے مزدور رہنماؤں کو اتوار کی شب اور اتوار کا دن کراچی میں انتہائی اذیت میں گذارنا پڑا کیونکہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی وجہ سے نہ یہ بیٹھ سکتے تھے نہ لیٹ سکتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عدالت کے قلم سے انحراف کا یہ نوکر شاہی رویہ قابل مواخذہ نہیں۔ ؟

نیشنل بنک کی نمائندہ ٹریڈ یونین

نیشنل بنک آف پاکستان ایمپلائیز فیڈریشن نے اپنے ایک اعلامیہ میں کہا ہے کہ فیڈریشن نے صنعتی تعلقات کے آرڈیننس کی دفعہ ۲۶ ب کے تحت انتظامیہ کو نوٹس دیا ہے کہ وہ تمام منظور شدہ مطالبات پر فوری عملدرآمد کرائے اور تین بنیادی تنخواہ بطور بونس ادا کرے۔ فیڈریشن نے انتظامیہ پر الزام لگایا ہے کہ وہ بعض سیاسی سرپرستوں کے مفادات کو پورا کرنے کی خاطر نیشنل بنک کے ملازمین کی نمائندہ فیڈریشن سے ملازمین کے مسائل پر بات چیت کرنے کے بجائے جماعتِ اسلامی کی پروردہ "ایمپلائیز فرنٹ" سے بات چیت کر رہی ہے جو قطعاً غیر قانونی ہے۔ پورے مغربی پاکستان میں نیشنل بنک آف پاکستان ایمپلائیز فیڈریشن کو قانونی طور پر سودا کاری کا حق حاصل ہے۔ صنعتی آرڈیننس کی دفعہ ۲۲-اے کے تحت انتظامیہ کسی دوسری فیڈریشن سے سودے کاری نہیں کر سکتی۔ جماعت اسلامی کی پروردہ نام نہاد ایمپلائیز فرنٹ سے بنک میں کام کرنے والے جماعتِ اسلامی کے حامی افسر اپنے مطالبات پیش کرانے کی سازش کر رہے ہیں جسے کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔ فیڈریشن نے صدر مملکت کو ایک یادداشت پیش کی ہے جس میں بنک کے افسروں کی سازش کی تفصیلات بتاتے ہوئے مداخلت کی اپیل کی گئی ہے۔ فیڈریشن نے جماعتِ اسلامی کو خبردار کیا ہے کہ وہ محنت کشوں میں پھوٹ ڈالنے کی پالیسی سے باز آجائے ورنہ اس کے بڑے سنگین نتائج نکلیں گے۔

شپ یارڈ ورک مین یونین کا جلسہ

جماعت اسلامی کی شہ پر پاکٹ یونین سے ساز باز بند کی جائے

کراچی شپ یارڈ ورک مین یونین کا ایک جلسہ ۴ جنوری کو شپ یارڈ کے گیٹ پر ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے یونین کے نائب صدر عبدالحمید نے منیجر ایڈمنسٹریشن مسٹر ایس ایچ زیدی پر الزام لگایا کہ وہ جماعت اسلامی کی شہ پر شپ یارڈ کی پاکٹ یونین سے ساز باز کر کے شپ یارڈ کے پرامن مزدوروں میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے الزام لگایا کہ ۲۱ نومبر ۷۰ء کو انتظامیہ کے پالتو غنڈوں نے یونین کے عہدیداروں پر حملہ کیا عبدالحمید نے کہا کہ اگر انتظامیہ نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے جلسہ میں آٹھ قراردادیں منظور کی گئیں جن میں ایڈمنسٹریشن مسٹر زیدی اور سلیم دہنا کو شپ یارڈ سے نکالنا، یونین کے تمام معطل شدہ کارکنوں کو کام پر واپس لینا، پی پی ایل کے نکالے ہوئے صحافیوں کو کام پر واپس لینا، آئین میں مزدوروں کے حقوق کا تحفظ، مہنگائی کے خلاف سخت اقدامات کا مطالبہ، فلسطینی حریت پسندوں کی منصفانہ جدوجہد کی حمایت اور تمام گرفتار شدہ مزدوروں، طلباء اور سیاسی کارکنوں کی رہائی شامل ہیں۔

کلیم الحسن نقوی پرنٹر، انیس ہاشمی پبلشر انجمن پریس میں چھپا۔ دفتر لیل و نہار عظمت منزل ۱۶/۱۲ سنٹرل کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع ہوا۔

THE LAILO-NAHAAR WEEKLY, KARACHI. R. L. No. S. 2744

31.1.1971

ہفت روزہ

لیل و نہار

کراچی

زیرِ ادارت :- فیض احمد فیضؔ - حسن عابدی

سالنامہ

زیرِ ترتیب ہے اور عنقریب شائع کیا جائے گا

ملکی اور بین الاقوامی صورت حالات پر مبنی سیاسی جائزے، اقتصادی میزانیئے اور ادبی و تہذیبی امور سے متعلق قیمتی دستاویزات، سالنامے کی زینت ہوں گی۔ نامور ادیبوں و دانشوروں کی تحقیقات سے مزین، لیل و نہار کا یہ خاص شمارہ صحافت میں ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔

ایجنٹ صاحبان اور مشتہرین اپنے آرڈر جلد بُک کرالیں

مینیجر :-

ہفت روزہ لیل و نہار کراچی

پوسٹ بکس ۳۱۷۸ - کراچی ۲۹

(فون نمبر ۴۱۷۴۹۸)

Lailo Nahaar Newsweekly Registered as a Newspaper with the Post Office in United Kingdom.